فہرست

شذرات	اخلاقی جارحیت	منظور الحسن	۲
قرآنیات	آل عمران (۳: ۱-۶)	جاوید احمد غامدی	۵
معارف نبوی	اوقات نماز میں تقدیم و تاخیر	زاویہ فراہی	۷
	تقدیر پر ایمان نہ لانے کی سزا	طالب محسن	۹
دین و دانش	قانون عبادات (۷)	جاوید احمد غامدی	۱۳
حالات و وقائع	مسئلۂ فلسطین	ڈاکٹر محمد فاروق خان	۲۳
	امام مالک بن انس	محمد رفیع مفتی	۴۳
	عروہ بن زبیر	محمد وسیم اختر مفتی	۴۸
اصلاح و دعوت	متفرق مضامین	امین احسن اصلاحی ۔ طالب محسن ۔ خورشید احمد ندیم ۔ محمد وسیم اختر مفتی ۔	۵۳
تبصرۂ کتب	''حیات رسول امی''	مقبول الرحیم مفتی	۶۵
ادبیات	غزل	جاوید احمد غامدی	۶۹
خبرنامہ			۷۲

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اخلاقی جارحیت

حقوق کے تحفظ کے لیے ہم مسلمانوں کا لائحۂ عمل مسلح جارحیت ہے۔ گزشتہ تین صدیوں سے ہم اسی پر کاربند ہیں۔ قوم کے مذہبی اور سیاسی پیشواؤں نے اسی کو اختیار کرنے کی تلقین کی ہے اور عوام الناس پوری دل جمعی سے اس پر عمل پیرا ہیں۔ اس کی روح یہ ہے کہ اگر ہم منتشر ہوں تو تشدد آمیز کارروائیوں کے ذریعے سے دنیا کو اپنے مسائل کی طرف متوجہ کریں اور اگر کچھ مجتمع ہوں تو جنگ و جدل سے اپنا حق حاصل کرنے کی جدوجہد کریں۔ یہ لائحۂ عمل اختیار کر کے ہم نے کیا کھویا اور کیا پایا ہے، اس کی تفصیل کشمیر، فلسطین، افغانستان اور عراق کے موجودہ حالات میں دیکھی جا سکتی ہے۔ تین صدیوں کے حوالے سے ہماری یافت و نایافت کی فہرست بندی کی جائے تو معلوم ہو گا کہ جو کچھ ہم نے حاصل کیا ہے، وہ شکست و تنزل اور غربت و جہالت ہے اور جس سے محروم ہوئے ہیں، وہ عظمت و رفعت اور علم و اخلاق ہے۔ مسلح جارحیت کے اس لائحۂ عمل کو ہم نے ہمیشہ جہاد سے تعبیر کیا ہے اور اس طرح اپنے مزعومہ اقدامات کو یہ عنوان دے کر دنیا کو پیغام دیا ہے کہ اسلامی شریعت خدانخواستہ جنگ و جدل کی علم بردار ہے۔

شریعت کی اصطلاح میں جہاد اقوام کے ظلم و جبر کے خلاف اسلامی ریاست کا مسلح اقدام ہے۔ قرآن مجید کی رو سے اس اقدام کے لیے قوت ایمانی کے ساتھ ساتھ مادی قوت کا حصول ناگزیر ہے۔ مگر ہمارا طرز عمل ہمیشہ یہ رہا ہے کہ نہایت کمزور ایمان اور اسلحے کی قوت سے بالکل محروم ہونے کے باوجود نصرت الٰہی کے دعوے کے ساتھ میدان جنگ میں اترتے رہے ہیں۔ یہ سفاہت ہے یا دین سے ناآشنائی، بہرحال اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ہم اپنے لاکھوں رجال کار کو جنگ کی بھینٹ چڑھا کر فارغ ہو چکے ہیں۔ اس پر مستزاد یہ ہے کہ ہم نے علم و دانش، اصلاح و دعوت اور قومی تعمیر و ترقی کے دروازے بھی بند کر رکھے ہیں۔

چنانچہ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ علم، اخلاق اور رزق کے معاملے میں ہم پر نہایت کس مپرسی کی حالت طاری ہے۔ ہم غربت کے اس مقام پر ہیں کہ ہماری اکثریت بنیادی ضروریات زندگی سے محروم ہے۔ جہالت کی یہ سطح ہے کہ ان علوم سے

بھی غافل ہو چکے ہیں جنھیں خود ہم نے وجود بخشا تھا۔ اخلاقی پستی کا یہ عالم ہے کہ بددیانتی، دھوکا دہی، ملاوٹ اور قانون شکنی میں دنیا بھر میں ہمارا کوئی ثانی نہیں ہے۔ بے وقاری کی یہ حالت ہے کہ بین الاقوامی معاملات میں ہم پر کوئی اعتماد کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اور مظلومیت کا یہ معاملہ ہے کہ صحیح ہوں یا غلط، ہر حال میں مجرم قرار پاتے ہیں اور سزا کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ہماری اس حالت زار کی سب سے بڑی وجہ لائحۂ عمل کی غلطی ہے۔ افغانستان اور عراق کے پے در پے سانحوں کے بعد ممکن ہے کہ ہم اس غلطی کا ادراک کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ اگر ایسا ہو جاتا ہے تو پھر ہمیں مسلح جارحیت کا لائحۂ عمل ترک کر کے اخلاقی جارحیت کے نئے لائحۂ عمل کو اختیار کرنا چاہیے۔ یہی وہ واحد راستہ ہے جسے اپنا کر کوئی کمزور اور مظلوم قوم اپنے لیے تعمیر و ترقی کے بند دروازے کھول سکتی ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے ہمیں اس حقیقت کا اعتراف کرنا چاہیے کہ ہم اگرچہ اپنی تعداد کے لحاظ سے دنیا کی چند بڑی اقوام میں شمار ہوتے ہیں، مگر قوت و استعداد کے لحاظ سے اقوام عالم میں ہمارا کوئی مقام نہیں ہے۔ دنیا کے سیاسی، اقتصادی اور سائنسی و تکنیکی منظر پر ہماری کوئی جگہ نہیں ہے اور نہ اس بات کا امکان ہے کہ مستقبل قریب میں کوئی جگہ پیدا ہو جائے۔ اس اعتراف حقیقت کے بعد ہمیں مسلح جدو جہد کے بجائے غیر مسلح طور پر اخلاقی جدو جہد کا آغاز کرنا چاہیے۔ ہم انفرادی اور اجتماعی اعتبار سے اعلیٰ اخلاقی معیار پر کھڑے ہو جائیں۔ قومی اور بین الاقوامی، دونوں معاملات میں اخلاقی موقف اپنائیں اور اس کے لیے اگر مفادات بھی قربان کرنے پڑیں تو اس سے دریغ نہ کریں۔ اگر تشدد کا سامنا کرنا پڑے تو صبر و استقامت کے ساتھ اس کا سامنا کریں۔ اپنے حقوق کی جدو جہد کو سر تا سر مظلومانہ بنائیں اور ظالم کو یہ موقع نہ دیں کہ وہ کسی بہانے ہم پر حملہ آور ہو سکے۔ اس مقصد کے لیے اگر تنازعات کو یک طرفہ طور پر بھی ختم کرنا پڑے تو اس سے بھی گریز نہ کریں۔ دنیا کے ایوانوں میں ہر حال میں مظلوم کا ساتھ دیں۔ عدل و انصاف کا دامن کسی حال میں نہ چھوڑیں خواہ اس کی زد اپنے قومی وجود ہی پر کیوں نہ پڑے۔ ہر طرح کے تعصب کو بالاے طاق رکھتے ہوئے آزادی، جمہوریت، مساوات اور انسانی ہمدردی جیسی اقدار کا بول بالا کریں۔ ہر حال میں جنگ کی مذمت کریں اور امن و سلامتی کی تلقین کریں۔ مذہبی اور سیاسی اختلافات کو برداشت کریں اور دوسروں کو بھی یہی طرز عمل اپنانے کی نصیحت کریں۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے موجودہ زمانے کی اخلاقی بیداری سے بھر پور فائدہ اٹھائیں، ان اداروں کی تعمیر و ترقی میں کردار ادا کریں جو دنیا میں انسانی حقوق کی آواز بلند کر رہے ہیں اور میڈیا کے تمام ذرائع کو پوری طرح بروے کار لائیں۔

اخلاقی جارحیت، درحقیقت صبر و برداشت اور حکمت و دانش سے عبارت ہے۔ جب کوئی قوم کسی ظالم قوم کے مقابلے میں مجبور و بے بس ہو، جب اس کے پاس دفاع کی معمولی طاقت بھی موجود نہ ہو، جب اقوام عالم میں سے کوئی اس کی مدد کی

www.javedahmadghamidi.org

ہمت نہ کر سکے اور جب دنیا میں کوئی ایسی عدالت بھی قائم نہ ہو جو اس پر ہونے والے ظلم کو قانون کی قوت سے روک سکے تو اس موقع پر واحد لائحۂ عمل اخلاقی جارحیت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جور وستم کا مقابلہ اخلاق و کردار کی قوت سے کیا جائے۔ قومی وجود میں امن، آزادی، استدلال، عدل، صلہ رحمی اور حق پرستی جیسی انسانیت کی مشترک اقدار کو مستحکم کیا جائے اور ان کی بنا پر انسان کے اجتماعی ضمیر کو آواز دی جائے۔ کوئی قوم اگر صبر و استقامت سے یہ آواز بلند کرتی رہے تو انسانیت کا اجتماعی ضمیر لازماً اس پر لبیک کہہ اٹھتا ہے۔ بصورت دیگر عالم کا پروردگار اپنی آواز اس آواز میں شامل کر دیتا ہے۔ مظلوم کی دادرسی آسمان سے ہوتی ہے اور ظلم و جبر کی بساط بالآخر لپیٹ دی جاتی ہے۔

منظور الحسن

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آل عمران

(۱)

(گزشتہ سے پیوستہ)

الٓمّٓ ﴿۱﴾ اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ﴿۲﴾ نَزَّلَ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْہِ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰۃَ وَالْاِنْجِیْلَ ﴿۳﴾ مِنْ قَبْلُ ھُدًی لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ لَھُمْ عَذَابٌ

یہ سورہ الم ہے[۱]۔ اللہ وہ ہستی ہے کہ اُس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، زندہ اور سب کو قائم رکھنے والا ہے[۲]۔ (لوگوں کو امتحان میں ڈال کر وہ اُن کی ہدایت سے بے پروا نہیں ہو سکتا تھا، لہٰذا) اُس نے یہ کتاب تم پر قول فیصل کے ساتھ اتاری ہے، اُن پیشین گوئیوں کی تصدیق میں جو اِس سے پہلے موجود ہیں، اور تورات و انجیل کو بھی اِس سے پہلے اُسی نے لوگوں کے لیے ہدایت بنا کر اتارا تھا، اور اب یہ فرقان بھی اُسی نے اتارا

[۱] سورۂ بقرہ کی طرح اس سورہ کا نام بھی الم ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اپنے مضمون کے لحاظ سے یہ دونوں سورتیں توام ہیں۔ اس نام کے معنی کیا ہیں؟ اس کے متعلق اپنا نقطۂ نظر ہم نے سورۂ بقرہ کی آیت ۱ کے تحت تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔

[۲] اصل میں لفظ 'قیوم' استعمال ہوا ہے۔ اس کے معنی ہیں وہ ہستی جو خود اپنے بل پر قائم اور دوسروں کو قائم رکھنے والی ہو۔ اس سے اور اس سے پہلے 'حی' کی صفت سے قرآن نے ان تمام معبودوں کی نفی کر دی ہے جو نہ زندہ ہیں، نہ دوسروں کو زندگی دے سکتے ہیں، اور نہ اپنے بل پر قائم ہیں، نہ دوسروں کو قائم رکھنے والے ہیں، بلکہ خود اپنی زندگی اور بقا کے لیے ایک

شَـدِيْـدٌ وَالـلّٰهُ عَزِيْزٌ ذُوانْتِقَامٍ ﴿۴﴾ اِنَّ الـلّٰـهَ لَا يَـخْـفٰى عَلَيْهِ شَیْءٌ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ ﴿۵﴾ هُـوَ الَّذِیْ يُصَوِّرُكُمْ فِی الْاَرْحَامِ كَيْفَ يَشَآءُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۶﴾

ہے[۳]۔ (یہ اللہ کی آیتیں ہیں، اور) جو لوگ جانتے بوجھتے اللہ کی آیتوں کے منکر ہوں، اُن کے لیے بڑا سخت عذاب ہے، اور اللہ زبردست ہے، وہ (اِس طرح کے لوگوں سے) انتقام لینے والا ہے۔ (اِس لیے کہ) زمین و آسمان کی کوئی چیز اللہ سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔ وہی تو ہے جو ماؤں کے پیٹ میں تمھاری صورتیں، جس طرح چاہتا ہے، بنا دیتا ہے۔ اُس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ وہ زبردست ہے، بڑی حکمت والا ہے[۴]۔ ۱۔۶

حی و قیوم کے محتاج ہیں۔

[۳] یعنی جب وہ لوگوں کا معبود بھی ہے اور حی و قیوم بھی تو کس طرح ممکن ہے کہ وہ انھیں امتحان کے لیے دنیا میں بھیجے اور پھر حق و باطل کے معاملے میں ان کی رہنمائی نہ فرمائے۔ چنانچہ لوگوں کو اختلافات کی تاریکی سے نکالنے کے لیے اپنی کتابوں کی صورت میں یہ روشنی اس نے نازل کر دی ہے۔

[۴] یعنی وہ جب ان کی سرکشی کو دیکھ بھی رہا ہے، ان کا معبود بھی وہی ہے، ان سے انتقام کی قدرت بھی رکھتا ہے اور ایک حکیم کی حیثیت سے اس کی حکمت کا تقاضا بھی ہے کہ اس طرح کے مجرموں کو ان کے انجام تک پہنچا دے تو ضروری تھا کہ وہ بدلہ لینے والا ہو۔ وہ اگر ایسا نہ کرے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ یا تو وہ انھیں دیکھ نہیں رہا یا تنہا وہی معبود نہیں ہے یا دنیا کے بعض معاملات اس نے دوسروں کے سپرد کر دیے ہیں یا بے بس ہے کہ اس طرح کے مجرموں کو پکڑنے کی قدرت نہیں رکھتا یا کھلنڈرا ہے کہ خیر و شر کو ایک ہی جگہ رکھ کر ان کا تماشا دیکھ رہا ہے۔

[باقی]

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اوقات نماز میں تقدیم وتاخیر

[اس روایت کی ترتیب وتدوین اور شرح ووضاحت جناب جاوید احمد غامدی کی رہنمائی میں ان کے رفقا معز امجد، منظور الحسن، محمد اسلم نجمی اور کوکب شہزاد نے کی ہے۔]

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

روي انه كان النبي صلى الله عليه وسلم إذا اشتد البرد بكر بالصلاة وإذا اشتد الحر أبرد[2] بالصلاة.[3]

روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم شدید سردی میں نمازیں ان کے اولین اوقات میں پڑھتے تھے اور شدید گرمی میں نمازوں کو ٹھنڈا کر کے پڑھتے تھے۔[1]

ترجمے کے حواشی

۱۔ شریعت میں نمازوں کے ابتدائی اور اختتامی اوقات متعین ہیں۔ ان کے دوران میں کسی وقت بھی انفرادی یا اجتماعی طور پر نمازیں ادا کی جا سکتی ہیں۔ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم با جماعت نمازوں کے اوقات مقرر کرتے ہوئے لوگوں کی سہولت ملحوظ رکھتے تھے۔ چنانچہ جن نمازوں میں تقدیم وتاخیر کر کے موسم کی شدت سے بچا جا سکتا ہے، انھیں آپ شدید سردی میں اولین اوقات میں پڑھتے تھے اور شدید گرمی میں موخر کر کے پڑھتے تھے۔

متن کے حواشی

۱۔ اپنی اصل کے اعتبار سے یہ بخاری کی روایت، رقم ۸۶۴ ہے۔ بعض اختلافات کے ساتھ یہ حسب ذیل مقامات پر نقل ہوئی ہے:

ابن خزیمہ، رقم ۱۸۴۲۔ بیہقی، رقم ۵۴۶۸، ۵۴۶۹، ۵۴۷۰۔

۲۔ بیہقی، رقم ۵۴۷۰ میں یہی بات ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے:

إذا كان الحر أبرد بالصلاة وإذا كان الحر بكر بالصلاة.

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم گرمیوں میں نماز کو ٹھنڈا کر کے پڑھتے تھے اور سردیوں میں اولین وقت میں پڑھتے تھے۔''

۳۔ بخاری، رقم ۸۶۴ سمیت بعض روایتوں میں یہ بات بیان ہوئی ہے کہ جمعے کی نماز میں بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی طریقہ تھا۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

طالب محسن

تقدیر پر ایمان نہ لانے کی سزا

(مشکوٰۃ المصابیح، حدیث: ۱۱۵)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

عن ابن الديلمى قال: أتيت أبى ابن كعب، فقلت له: قد وقع فى نفسى شىء من القدر، فحدثنى لعل اللّٰه أن يذهبه من قلبى. فقال: لو أن اللّٰه عزوجل عذب أهل سماواته وأهل أرضه، عذبهم وهو غير ظالم لهم، ولو رحمهم كانت رحمته خيرا من أعمالهم، ولو أنفقت مثل أحد ذهبا فى سبيل اللّٰه ما قبله اللّٰه منك حتى تؤمن بالقدر وتعلم أن ما أصابك لم يكن ليخطئك، وأن ما أخطأك لم يكن ليصيبك. ولو مت على غير هذا لدخلت النار. قال: ثم أتيت عبد اللّٰه بن مسعود، فقال مثل ذلك. قال: ثم أتيت حذيفة بن اليمان، فقال مثل ذلك. ثم أتيت زيد بن ثابت فحدثنى عن النبى صلى اللّٰه عليه وسلم مثل ذلك.

''حضرت ابن دیلمی بیان کرتے ہیں کہ میں ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور ان سے کہا: میرے دل میں تقدیر کے بارے میں کچھ شک سا پیدا ہو گیا ہے۔ آپ مجھے کوئی حدیث بتایئے

جس سے اللہ تعالیٰ میرے دل سے یہ شک نکال دیں۔ انھوں نے (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان) سنایا: اگر اللہ تعالیٰ نے اپنے آسمان والوں اور اپنی زمین والوں کو عذاب دیا تو انھوں نے اس طرح عذاب دیا کہ ان پر کوئی ظلم نہیں کیا۔ اور اگر ان پر رحم کیا تو ان کی رحمت ان کے اعمال سے بہتر تھی۔ اور اگر تم احد کے برابر سونا بھی خیرات کر دو تو اللہ جب تک تم تقدیر پر ایمان نہ لاؤ، اسے قبول نہیں کریں گے۔ جان رکھو، جو (خیر و شر) تمھیں پہنچا، وہ ٹلنے والا نہیں تھا۔ اور جو نہیں پہنچا وہ آنے والا نہیں تھا۔ اگر تم اس (عقیدے) سے ہٹ کر مرے تو جہنم میں جاؤ گے۔ انھوں نے بتایا کہ پھر میں عبد اللہ بن مسعود کے پاس گیا تو انھوں نے بھی یہی بات بتائی۔ پھر میں حذیفہ بن یمان کے پاس گیا تو انھوں نے بھی یہی روایت سنائی۔ پھر میں زید بن ثابت کے پاس گیا تو انھوں نے بھی یہی فرمایا۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

لغوی مباحث

وقع فی نفسی شیء: دل میں کسی چیز کے بارے میں خیال پیدا ہونا۔ یہاں یہ کھٹک پیدا ہونے کے معنی کے لیے ہے۔

فحدثنی: یہ امر ہے اور اس کے لغوی معنی 'بیان کیجیے' کے ہیں، لیکن یہاں یہ اصطلاحی معنی میں استعمال ہوا ہے اور اس سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی ارشاد کو روایت کرنا ہے۔

فھو غیر ظالم لھم: وہ ان پر ظلم نہیں کر رہا ہے۔ یہ جملہ حالیہ ہے۔

متون

ابوداؤد اور ابن ماجہ میں اس روایت کا یہی متن نقل ہوا ہے۔ مسند احمد میں اس روایت کے قدرے مختلف متن روایت ہوئے ہیں۔ لیکن یہ فرق بھی محض لفظی ہیں۔ مثلاً 'أتیت' کی جگہ 'لقیت'، 'من القدر' کے بدلے 'من ھذا القدر'، 'لعل اللّٰہ' کے بجائے 'لعلہ'، 'لو' کے جواب 'عذبھم' پر لام، 'مثل احد' کی جگہ 'جبل احد' اور اسی طرح جن صحابہ سے ملاقات ہوئی ہے، ان کے ناموں کی ترتیب بیان کا فرق۔ سب سے دل چسپ فرق اس روایت کا ہے جس میں ایک ہی صحابی

سے یہ ملاقات بیان ہوئی ہے اور وہ زید بن ثابت ہیں۔

معنی

اس روایت کے دو حصے ہیں۔ ایک حصہ ایک تابعی کے اضطراب اور اسے دور کرنے کی سعی سے متعلق ہے اور دوسرا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے بیان کیے گئے الفاظ پر مشتمل ہے۔

پہلا حصہ ہمارے لیے اپنے اندر ایک سبق رکھتا ہے اور وہ یہ ہے کہ جب بھی دین کے کسی جز کے بارے میں کوئی مسئلہ پیدا ہو تو کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ ابن دیلمی نے بالکل صحیح کیا کہ وہ ان صحابہ کے پاس گئے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سکھائے ہوئے علم سے واقف تھے اور اس کے مطابق ان کی تشفی کر سکتے تھے۔ شارحین کے خیال میں ان کا اضطراب یہ تھا کہ کیا جبریہ کا نقطۂ نظر صحیح ہے یا قدریہ کی رائے درست ہے۔ ایک شارح کے نزدیک ابن دیلمی کے دل میں تقدیر کے انکار کا رجحان پیدا ہو رہا تھا۔ بہر حال صورت کچھ بھی ہو، ان کا رویہ بالکل درست ہے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں انھیں کوئی ایسی آیت نہیں ملی جو ان کے سوال کا جواب دے دیتی۔ چنانچہ وہ اپنے موضوع سے متعلق حدیث کو جاننے کے لیے صحابہ رضوان اللہ علیہم سے ملے۔ درآں حالیکہ قرآن مجید میں یہ بات بڑی تفصیل سے بیان ہوئی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس نظام ہستی کو کس طرح چلا رہے ہیں۔ حیرت ہے کہ ابن دیلمی کا اشکال دور کرنے کے لیے کسی آیت سے استشہاد نہیں کیا گیا۔

دوسرا حصہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد پر مشتمل ہے۔ اس میں دو باتیں وضاحت طلب ہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام آسمان وزمین کی مخلوق کو جہنم میں ڈال دیں تو یہ ناانصافی نہیں ہوگی۔ اس میں شارحین فرشتوں اور انبیا اور صالحین کو شامل کرتے ہیں۔ ہمارے خیال میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ منشا نہیں ہو سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جہنم اور جنت جزا وسزا کے لیے بنائے ہیں۔ قیامت کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ بار بار واضح کیا ہے کہ وہاں کامل انصاف ہوگا۔ چنانچہ کسی نیکوکار کے جہنم میں ڈالے جانے کو کسی طرح انصاف قرار نہیں دیا جا سکتا۔ شارحین نے اس بات کو درست قرار دینے کے لیے یہ استدلال کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ خالق و مالک ہیں اور انھیں ہر طرح کے تصرف کا حق حاصل ہے، لہٰذا وہ اپنے اس حق تصرف کو استعمال کرتے ہوئے اگر کسی نیک آدمی کو جہنم میں ڈالتے ہیں تو اسے غلط کیسے قرار دیا جا سکتا ہے۔ ہمارے خیال میں حق تصرف ایک حقیقت ہے۔ لیکن یہ تصرف کا حق کسی ظالم بادشاہ کو حاصل نہیں ہے کہ وہ جو چاہے کرے۔ اللہ تعالیٰ ایک عادل ہستی ہیں اور ان کا کوئی تصرف عدل کے منافی نہیں ہو سکتا اور ان کے عدل ہی کا تقاضا ہے کہ وہ کسی ناانصافی کو عدل قرار نہ دیں۔ اس سے اگلا جملہ بخشش کو محض اللہ تعالیٰ کی رحمت قرار دیتا ہے۔ یہ بات ایک اعتبار سے درست ہے۔ لیکن اس کا یہ تاثر کہ اس کا نیکی و بدی سے کوئی تعلق نہیں قرآن مجید کے منافی ہے۔ قرآن مجید واضح الفاظ میں

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

جنت کو نیکی کا صلہ قرار دیتا ہے۔ سورۂ زخرف میں ہے:

تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ. (۴۳:۷۲)

''یہ ہے جنت جس کا میں نے تمھیں مالک بنایا ہے، ان (نیکیوں) کے بدلے میں جو تم کرتے رہے ہو۔''

ہمارے نزدیک بات یقیناً اس سے مختلف ہو گی۔ لیکن روایت ہونے میں اس کا ضروری حصہ نقل نہیں ہو سکا اور بات کا تاثر بالکل بدل گیا ہے۔

دوسری بات یہ بیان ہوئی کہ تقدیر پر ایمان کے بغیر کوئی نیکی قبول نہیں ہوتی۔ احد کے برابر سونا خیرات کرنے کی مثال سے یہ بات واضح کی گئی ہے کہ وہ نیکی خواہ کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو۔ شارحین کے نزدیک اس کی وجہ اس شخص کا مبتدع ہونا ہے یعنی اس نے ایک ایسا عقیدہ اختیار کر لیا ہے جو اسلام میں نیا ہے اور اس روایت نے یہ واضح کر دیا ہے کہ یہ اتنی بڑی برائی ہے کہ بڑی سے بڑی نیکی کو بھی کھا جائے گی۔ بعض شارحین تقدیر کے انکار کو کفر قرار دیتے ہیں اور ظاہر ہے کفر کا یہی انجام ہو گا۔

خیال ہوتا ہے کہ روایت کا یہ حصہ اسی نوع کی روایات سے تعلق رکھتا ہے جو جبریہ اور قدریہ کے ساتھ مناظروں میں پیش کی گئیں اور جن کی کچھ تعداد محدثین کے معیار پر پوری اترنے کی وجہ سے صحاح کا حصہ بن گئی۔ روایت کے مضمون کا اجنبی ہونا خود راویوں پر بھی واضح ہے۔ غالباً اسی وجہ سے اپنی بات کو موکد کرنے کے لیے متعدد صحابہ کا نام لیا گیا ہے۔

یہ روایت البانی مرحوم کی رائے کے مطابق سند کے اعتبار سے صحیح ہے، لیکن اس کے مضمون پر غور کریں تو کئی پہلوؤں سے محل نظر ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

کتابیات

ابن ماجہ، رقم ۷۴۔ ابوداؤد، رقم ۴۰۷۷۔ احمد، رقم ۲۰۶۰۷، ۲۰۶۶۶، ۲۰۶۲۶۔ تالی تلخیص المشابہ، رقم ۱۹۸۔

جاوید احمد غامدی

قانون عبادات

(۷)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

نماز کی جماعت

نماز اگرچہ تنہا بھی ادا کی جا سکتی ہے، لیکن انبیا علیہم السلام کے دین میں یہ سنت ہمیشہ سے قائم رہی ہے کہ تزکیۂ اجتماعیت کی غرض سے اس کو جماعت کے ساتھ اور ممکن ہو تو کسی معبد میں جا کر ادا کیا جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی مقصد سے یثرب پہنچ کر سب سے پہلے مسجد تعمیر کی اور مسلمانوں کی ہر بستی اور ہر محلے میں تعمیر مساجد کی روایت اس کے ساتھ ہی قائم ہو گئی۔ یہ مسجد یں اب دنیا میں ہر جگہ دیکھی جا سکتی ہیں۔ ان کی تعمیر کے لیے دین میں کوئی خاص وضع متعین نہیں کی گئی۔ تاہم مسلمانوں نے بعض اختلافات کے ساتھ اسے کم و بیش متعین کر رکھا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حین حیات جب آپ کی امامت میں نماز ادا کرنے کے لیے اذان دی جاتی تھی تو ان سب لوگوں کے لیے مسجد میں حاضری ضروری تھی جن تک اذان کی آواز پہنچ جائے۔ پھر جب اللہ تعالیٰ کے قانون اتمام حجت کے مطابق مسلمانوں کی تطہیر کے موقع پر منافقین کو ان سے الگ کرنے کے لیے مختلف اقدامات کیے گئے تو یہ بھی ہوا کہ ایک نابینا نے مسجد کی حاضری سے رخصت چاہی تو آپ نے پہلے رخصت دے دی، پھر پوچھا کہ اذان سنتے ہو؟ اس نے اثبات میں جواب دیا تو فرمایا: پہنچنا ہو گا۔[۱۹۴] نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی موقع پر تہدید فرمائی تھی کہ جو لوگ نماز میں نہیں پہنچتے، چاہتا ہوں کہ ان کے گھر جلا کر ان پر پھینک دوں۔[۱۹۵] ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ بیمار بھی اس

۱۹۴؎ مسلم، رقم ۶۵۳۔

زمانے میں دو آدمیوں کا سہارا لے کر جماعت میں حاضر ہوتے تھے۔[196] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد، ظاہر ہے کہ حکم کی یہ صورت تو باقی نہیں رہی، لیکن مسجد کی حاضری اور نماز باجماعت کا اہتمام اب بھی بڑی فضیلت کی چیز ہے۔ لہٰذا کسی مسلمان کو بغیر کسی عذر کے اس سے محروم نہیں رہنا چاہیے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اس باب میں یہ ہیں:

''تنہا نماز پڑھنے سے جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا ۲۷ درجے زیادہ ہے۔''[197]

''اگر لوگ جانتے کہ اذان کے وقت پہنچنے اور پہلی صف میں کھڑے ہونے کا کیا اجر ہے، پھر اس کے لیے قرعہ ڈالنے کے سوا کوئی وجہ ترجیح نہ پاتے تو یہی کرتے۔ اور اگر جانتے کہ ظہر کی جماعت کے لیے سبقت کرنے میں کیا اجر ہے تو اس کے لیے ایک دوسرے سے سبقت کرتے۔ اور اگر جانتے کہ فجر اور عشا کے لیے حاضر ہونے میں کیا اجر ہے تو اس کے لیے گھسٹ کر بھی پہنچنا پڑتا تو پہنچتے۔''[198]

''جس نے عشا کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھی، اس نے گویا آدھی رات قیام کیا اور جس نے صبح کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھی، اس نے گویا پوری رات قیام میں گزاری۔''[199]

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

عورتیں، البتہ اس حکم سے مستثنیٰ ہیں۔ ان کے معاملے میں سنت یہی ہے کہ وہ نماز کے لیے مسجد میں آسکتی ہیں، لیکن گھر کی نماز ان کے لیے اس کے مقابلے میں بہتر ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: اپنی عورتوں کو مسجدوں میں آنے سے نہ روکو، لیکن ان پر یہ واضح رہنا چاہیے کہ ان کے گھر اس مقصد کے لیے زیادہ موزوں ہیں۔[200]

قیام جماعت کے لیے شریعت کا متعین کردہ طریقہ درج ذیل ہے:

۱۔ نماز سے پہلے اذان دی جائے گی تاکہ لوگ اسے سن کر جماعت میں شامل ہوسکیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جو کلمات مقرر فرمائے ہیں، وہ یہ ہیں:

اللّٰہ اکبر ؛ اشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ ؛ اشھد ان محمداً رسول اللّٰہ ؛ حی علی الصلوٰۃ ؛ حی علی الفلاح ؛ اللّٰہ اکبر ؛ لا الٰہ الا اللّٰہ.

۱۹۵؎ بخاری، رقم ۶۱۸۔

۱۹۶؎ مسلم، رقم ۶۵۴۔

۱۹۷؎ بخاری، رقم ۶۱۹۔

۱۹۸؎ بخاری، رقم ۶۲۴۔

۱۹۹؎ مسلم، رقم ۶۵۶۔

۲۰۰؎ ابوداؤد، رقم ۵۶۷۔

۲۔ایک ہی مقتدی ہوتو وہ امام کے دائیں جانب اس کے ساتھ کھڑا ہوگا اور زیادہ ہوں تو امام درمیان میں ہوگا اور وہ اس کے پیچھے صف بنا کر کھڑے ہوں گے۔

۳۔نماز کھڑی کرنے کے لیے اقامت کہی جائے گی۔اس میں اذان ہی کے الفاظ دہرائے جائیں گے۔اتنا فرق،البتہ ہوگا کہ 'حی علی الفلاح' کے بعد اقامت کہنے والا 'قد قامت الصلوٰۃ' بھی کہے گا۔

۴۔اذان اور اقامت کے کلمات پیش نظر مقصد کے لیے ایک سے زیادہ مرتبہ دہرائے بھی جا سکتے ہیں۔

قیام جماعت کا یہ طریقہ اجماع اور تواتر عملی سے ثابت ہے۔اس کی جو تفصیلات روایتوں میں بیان ہوئی ہیں،وہ ایک ترتیب کے ساتھ ہم یہاں بیان کیے دیتے ہیں۔

اذان

اذان کی ابتدا کے بارے میں صحابہ کا جو خواب روایتوں میں نقل ہوا ہے اور جس کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو اذان اور اقامت کا حکم دیا،اس میں اذان کے کلمات اس طرح دہرائے گئے ہیں:اللّٰہ اکبر ، اللّٰہ اکبر ، اللّٰہ اکبر، اللّٰہ اکبر ؛ اشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ ، اشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ ؛ اشھد ان محمداً رسول اللّٰہ، اشھد ان محمداً رسول اللّٰہ ؛ حی علی الصلوٰۃ ، حی علی الصلوٰۃ ؛ حی علی الفلاح ، حی علی الفلاح ؛ اللّٰہ اکبر ، اللّٰہ اکبر ؛ لا الٰہ الا اللّٰہ۔[201]

چنانچہ بیان کیا گیا ہے کہ زمانۂ رسالت میں اذان کے کلمات بالعموم دو دو مرتبہ کہے جاتے تھے۔[202]

ابو محذورہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں اذان سکھائی تو فرمایا:تم اس طرح کہو گے:اللّٰہ اکبر ، اللّٰہ اکبر، اللّٰہ اکبر، اللّٰہ اکبر؛ اشھدان لاالٰہ الااللّٰہ ، اشھدان لاالٰہ الا اللّٰہ؛ اشھد ان محمداً رسول اللّٰہ، اشھد ان محمداً رسول اللّٰہ۔پھر اسے دہراؤ گے:'اشھد ان لا الہ الا اللّٰہ ، اشھد ان لا الہ الا اللّٰہ؛ اشھد ان محمداً رسول اللّٰہ ، اشھد ان محمداً رسول اللّٰہ'۔اس کے بعد کہو گے:'حی علی الصلوٰۃ، حی علی الصلوٰۃ؛ حی علی الفلاح، حی علی الفلاح؛ اللّٰہ اکبر، اللّٰہ اکبر؛ لاالٰہ الا اللّٰہ'۔[203]

انھی کا بیان ہے کہ آپ نے مجھے 'اشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ، اشھد ان محمداً رسول اللّٰہ' دو مرتبہ پست آواز میں اور اس کے بعد دو مرتبہ بلند آواز سے دہرانے کی ہدایت فرمائی۔نیز یہ بھی فرمایا کہ صبح کی نماز ہوتو اس میں 'حی علی

---

۲۰۱ ابوداؤد،رقم ۴۹۹۔

۲۰۲ بخاری،رقم ۵۸۷۔مسلم،رقم ۳۷۸۔

۲۰۳ ابوداؤد،رقم ۵۰۳۔

الفلاح' کے بعد' الصلوٰۃ خیر من النوم، الصلوٰۃ خیر من النوم' بھی کہو گے۔[204]

روایتوں میں ہے کہ بارش برستی یا سردی زیادہ ہوتی تو رات کی نماز کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے موذن سے اعلان کرا دیتے تھے کہ: 'الا صلوا فی الرحال'[205] (لوگو، اپنے گھروں ہی میں نماز پڑھ لو۔)

اسی طرح یہ بات بھی بیان ہوئی ہے کہ آواز بلند کرنے اور اسے ہر طرف پہنچانے کے لیے بلال رضی اللہ عنہ اذان دیتے ہوئے اپنی انگلیاں کانوں میں رکھتے اور چہرہ دائیں اور بائیں پھیرتے تھے۔[206]

عثمان بن ابی العاص کہتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے امامت کی اجازت چاہی تو آپ نے فرمایا: موذن کسی ایسے شخص کو مقرر کرنا جو اذان دینے کی اجرت نہ لے۔[207]

اذان کے جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے موذن ہی کے کلمات دہرانے اور اپنے اوپر رحمت بھیجنے کی تلقین کی اور فرمایا کہ اس کے بعد میرے لیے مقام تقرب کی دعا کرو، اس لیے کہ یہ جنت میں ایک درجہ ہے جو اللہ کے بندوں میں سے ایک ہی بندے کے لیے خاص کیا گیا ہے اور مجھے امید ہے کہ وہ میں ہوں گا۔ سو جس نے یہ دعا کی، وہ میری شفاعت کا مستحق ہو جائے گا۔[208]

سیدنا عمر کی روایت میں مزید یہ وضاحت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے' حی علی الصلوٰۃ' اور' حی علی الفلاح' کے جواب میں' لا حول و لا قوۃ الا باللّٰہ' کہنے کی ہدایت کی اور فرمایا کہ جس نے سچے دل سے اذان کا جواب دیا، اس کے لیے جنت کی بشارت ہے۔[209]

اذان کے بعد کی جو دعائیں آپ سے منقول ہیں، وہ یہ ہیں:

۱۔ اللّٰھم رب ھذہ الدعوۃ التامۃ، و الصلوٰۃ القائمۃ، اٰت محمداً الوسیلۃ و الفضیلۃ، و ابعثہ مقاماً محموداً الذی وعدتہ.[210]

---

[204] ابوداؤد، رقم ۵۰۰۔

[205] بخاری، رقم ۶۳۵۔ مسلم، رقم ۶۹۷۔

[206] ترمذی، رقم ۱۹۷۔

[207] ابوداؤد، رقم ۵۳۱۔

[208] مسلم، رقم ۳۸۴۔

[209] مسلم، رقم ۳۸۵۔

[210] بخاری، رقم ۵۸۹۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

”اے اللہ، اس دعوت کامل اور اس کے نتیجے میں کھڑی ہونے والی نماز کے پروردگار، تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو فضیلت دے اور مقام تقرب عطا فرما، اور انھیں قیامت کے دن اسی طرح ممدوح خلائق بنا کر اٹھا جس طرح تو نے اس کا وعدہ فرمایا ہے۔“

۲۔ اشهد ان لا الٰه الا اللّٰه، وحده لا شريك له، وان محمداً عبده ورسوله، رضيت باللّٰه ربا، وبمحمد رسولاً، وبالاسلام ديناً.[۲۱۱]

”میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ وہ یکتا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ اور گواہی دیتا ہوں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اُس کے بندے اور رسول ہیں۔ میں راضی اور مطمئن ہوں کہ اللہ میرا پروردگار ہے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اُس کے رسول ہیں اور اسلام میرا دین ہے۔“

پہلی دعا کے بارے میں آپ کا ارشاد ہے کہ جس نے اس کا اہتمام کیا وہ میری شفاعت کا مستحق ہوگا،[۲۱۲] اور دوسری دعا کے بارے میں فرمایا ہے کہ اُس کے گناہ بخش دیے جائیں گے۔[۲۱۳]

اقامت

اقامت بالعموم اکہری کہی جاتی تھی۔[۲۱۴] صحابہ کے جس خواب کا ذکر اوپر ہوا ہے، اس میں اقامت کے کلمات اس طرح روایت کیے گئے ہیں: اللّٰه اكبر، اللّٰه اكبر؛ اشهد ان لا الٰه الا اللّٰه؛ اشهد ان محمداً رسول اللّٰه؛ حى على الصلوٰة؛ حى على الفلاح؛ قد قامت الصلوٰة، قد قامت الصلوٰة؛ اللّٰه اكبر، اللّٰه اكبر؛ لا الٰه الا اللّٰه.[۲۱۵]

ابومحذورہ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں اقامت کے یہ سترہ کلمات سکھائے تھے: اللّٰه اكبر، اللّٰه اكبر، اللّٰه اكبر، اللّٰه اكبر؛ اشهد ان لا الٰه الا اللّٰه، اشهد ان لا اله اللّٰه؛ اشهد ان محمداً رسول اللّٰه، اشهد ان محمداً رسول اللّٰه؛ حى على الصلوٰة، حى على الصلوٰة؛ حى على الفلاح، حى على الفلاح؛ قد قامت الصلوٰة، قد قامت الصلوٰة؛ اللّٰه اكبر، اللّٰه اكبر؛ لا اله الا اللّٰه.[۲۱۶]

---

۲۱۱ مسلم، رقم ۳۸۶۔

۲۱۲ بخاری، رقم ۵۸۹۔

۲۱۳ مسلم، رقم ۳۸۶۔

۲۱۴ بخاری، رقم ۶۰۳۔ مسلم، رقم ۳۷۸۔

۲۱۵ ابوداؤد، رقم ۴۹۹۔

۲۱۶ ابوداؤد، رقم ۵۰۲۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

امام

نماز ہر نیک و بد مسلمان کے پیچھے پڑھی جائے گی۔ تاہم اس کی امامت کے لیے کسی کا انتخاب پیش نظر ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی ہے کہ یہ ذمہ داری اس شخص کو دی جائے جو لوگوں میں زیادہ قرآن پڑھنے والا ہو۔ پھر اگر وہ قرآن پڑھنے میں برابر ہوں تو جو ان میں سنت کا زیادہ جاننے والا ہو، اگر سنت کے جاننے میں برابر ہوں تو جس نے پہلے ہجرت کی ہو، اور اگر اس میں بھی برابر ہوں تو جو عمر میں بڑا ہو۔ نیز فرمایا کہ کوئی شخص کسی کے دائرۂ اختیار میں امامت نہ کرے، بلکہ جس کے ہاں جائے اس کی امامت میں نماز پڑھے۔[۲۱۷]

آپ کا ارشاد ہے کہ امام کو ہلکی نماز پڑھانی چاہیے۔ اس لیے کہ اس کے پیچھے بیمار بھی ہو سکتے ہیں، کمزور بھی اور بوڑھے بھی۔[۲۱۸] انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کامل، مگر ہلکی نماز پڑھاتے ہوئے کسی کو نہیں دیکھا۔ آپ کا معاملہ تو یہ تھا کہ کسی بچے کے رونے کی آواز سنتے تو اس کی ماں کی تشویش کے خیال سے نماز مزید ہلکی کر دیتے تھے۔[۲۱۹]

امام کو نماز کی صفیں خاص اہتمام کے ساتھ سیدھی کرانی چاہییں۔ نعمان بن بشیر کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری صفیں اس طرح سیدھی کراتے تھے، گویا ان سے تیر سیدھے کر رہے ہوں۔[۲۲۰]

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

مقتدی

امام کے پیچھے جو لوگ نماز کے لیے کھڑے ہوں، انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید فرمائی ہے کہ اپنے امام سے سبقت کرنے کی کوشش نہ کریں، بلکہ اس کی تکبیر کے پیچھے تکبیر کہیں، اس کے 'سمع اللّٰہ لمن حمدہٗ' کہنے کے بعد 'ربنا، ولك الحمد' کہیں اور نماز کے اعمال میں بھی ہر موقع پر اس کی پیروی کریں۔[۲۲۱] انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ایک دن نماز کے بعد آپ ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: لوگو، میں تمھارا امام ہوں۔ مجھ سے نہ رکوع میں آگے بڑھو، نہ سجدے میں، نہ قیام میں اور نہ نماز ختم کرنے میں۔[۲۲۲]

۲۱۷؎ مسلم، رقم ۶۷۳۔

۲۱۸؎ بخاری، ۶۷۱۔

۲۱۹؎ بخاری، رقم ۶۷۶۔

۲۲۰؎ مسلم، رقم ۶۳۶۔

۲۲۱؎ بخاری، رقم ۷۰۰۔

۲۲۲؎ مسلم، رقم ۴۲۶۔

اسی طرح تاکید فرمائی ہے کہ نماز کی صفیں سیدھی رکھی جائیں[۲۲۳]، مونڈھے برابر ہوں، درمیان میں خلل نہ ہو، لوگ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کھڑے ہوں[۲۲۴]۔ عاقل و بالغ آگے آئیں، پھر ان سے چھوٹے اور اس کے بعد ان سے چھوٹے[۲۲۵]۔

پہلی صف پہلے پوری کی جائے، اس کے بعد دوسری، پھر تیسری[۲۲۶]۔ صفیں برابر رکھنے کو آپ نے نماز کی اقامت کا تقاضا قرار دیا[۲۲۷] اور فرمایا کہ لوگو، اپنے بھائیوں کے لیے نرم رہو اور صفوں میں شیطان کے لیے جگہیں نہ چھوڑو، اور یاد رکھو کہ جس نے صف ملائی، اسے اللہ ملائے گا اور جس نے صف توڑی، اس کا رشتہ اللہ لوگوں سے توڑ دے گا[۲۲۸]۔ اسی طرح فرمایا کہ تم بھی فرشتوں کی طرح صف بندی کرو، وہ اپنے پروردگار کے حضور میں ہمیشہ مل کر کھڑے ہوتے ہیں اور آگے کی صفوں کو پہلے پورا کرتے ہیں[۲۲۹]۔

نماز کے لیے پہلی صف میں پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیے، روایتوں میں اس کی فضیلت بیان ہوئی ہے[۲۳۰]۔ تاہم کسی وقت دیر ہو رہی ہو تو چاہیے کہ آدمی اطمینان اور وقار کے ساتھ آئے اور جتنی نماز ملے، اسے پڑھ کر باقی خود پوری کر لے[۲۳۱]۔

صف بندی امام کے آنے پر کرنی چاہیے[۲۳۲] اور صف میں ایک ہی آدمی نہیں ہونا چاہیے۔ بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی شخص کو اس طرح نماز پڑھتے دیکھا تو اسے نماز دہرانے کے لیے کہا[۲۳۳]۔ عورتوں کو البتہ آپ نے اس کا پابند نہیں کیا۔ انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر نماز پڑھائی تو دو آدمی آگے تھے اور ام سلیم تنہا پچھلی صف میں کھڑی تھیں[۲۳۴]۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

۲۲۳؎ بخاری، رقم ۶۸۷۔

۲۲۴؎ ابوداؤد، رقم ۶۶۶۔

۲۲۵؎ مسلم، رقم ۴۳۲۔

۲۲۶؎ ابوداؤد، رقم ۶۷۱۔

۲۲۷؎ بخاری، رقم ۶۹۰۔

۲۲۸؎ ابوداؤد، رقم ۶۶۶۔

۲۲۹؎ مسلم، رقم ۴۳۰۔

۲۳۰؎ بخاری، رقم ۵۹۰۔ مسلم، رقم ۴۳۷۔

۲۳۱؎ بخاری، رقم ۶۱۰۔

۲۳۲؎ بخاری، رقم ۶۱۱۔

۲۳۳؎ ابوداؤد، رقم ۶۸۲۔

۲۳۴؎ بخاری، رقم ۶۹۴۔

دنیا کی مسجدوں میں قدیم ترین مسجد بیت الحرام ہے۔ اسے سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کیا۔ یروشلم کی مسجد کے بانی سیدنا داؤد ہیں اور یثرب کی مسجد خدا کے آخری پیغمبر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعمیر کی ہے۔ یہ تینوں مسجدیں خصوصی حیثیت کی حامل ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ یہی تین مسجدیں ہیں جن کی زیارت اور جن میں نماز ادا کرنے کے لیے لوگ سفر کر سکتے ہیں۔[۲۳۵] ان میں نماز کی بڑی فضیلت ہے۔ چنانچہ اپنی مسجد کے بارے میں آپ کا یہ ارشاد روایتوں میں نقل ہوا ہے کہ اس کی نماز بیت الحرام کے سوا باقی سب مسجدوں میں ہزار نمازوں سے بہتر ہے۔[۲۳۶] ان کے علاوہ جتنی مسجدیں دنیا میں بنی ہیں یا آیندہ بنائی جائیں گی، ان کا درجہ بالکل یکساں ہے۔ یہ بیع وشرا، میلے ٹھیلے اور تفریحات کے لیے نہیں، بلکہ اللہ کی عبادت کے لیے بنائی جاتی ہیں۔ اللہ کو زمین پر سب سے زیادہ پسند یہی عمارتیں ہیں۔[۲۳۷] ان میں بیٹھ کر نماز کا انتظار بھی نماز ہی ہے۔[۲۳۸] لوگ ان میں جتنی دور سے عبادت کے لیے آئیں گے، ان کا اجر اتنا ہی زیادہ ہوگا۔[۲۳۹] ان میں آنے کے جو آداب شریعت میں مقرر کیے گئے ہیں، وہ یہ ہیں:

۱۔ مسجد میں آنے کے بعد، اگر کوئی عذر مانع نہ ہو تو آدمی کو دو رکعت نماز پڑھ کر مسجد میں بیٹھنا چاہیے۔

۲۔ آدمی نماز پڑھ کر بھی آیا ہو اور مسجد میں نماز کھڑی ہو جائے تو بغیر کسی عذر کے اسے جماعت سے الگ نہیں رہنا چاہیے، بلکہ اس میں شامل ہو جانا چاہیے۔

یہ دونوں باتیں روایتوں میں بھی بڑی تاکید کے ساتھ بیان ہوئی ہیں۔[۲۴۰] نیز یہ بات بھی نقل ہوئی ہے کہ مسجد میں داخل ہوتے وقت آپ اللہ سے تعوذ کرتے تھے۔ اس تعوذ کے الفاظ درج ذیل ہیں:

اعوذ باللّٰہ العظیم، و بوجھہ الکریم، وسلطانہ القدیم من الشیطان الرجیم.[۲۴۱]

''میں شیطان مردود سے خدائے عظیم، اس کی ذاتِ کریم اور سلطانِ قدیم کی پناہ میں آتا ہوں۔''

---

۲۳۵ بخاری، رقم ۱۱۳۲۔ مسلم، رقم ۱۳۹۷۔

۲۳۶ بخاری، رقم ۱۱۳۳۔ مسلم، رقم ۱۳۹۴۔

۲۳۷ مسلم، رقم ۱۷۱ ۶۔

۲۳۸ بخاری، رقم ۶۲۰۔

۲۳۹ مسلم، رقم ۶۶۴، ۶۶۵۔

۲۴۰ بخاری، رقم ۴۳۳، ۸۸۹۔ ابوداؤد، رقم ۵۷۵، ۵۷۷۔

۲۴۱ ابوداؤد، رقم ۴۶۶۔

اسی طرح یہ بھی منقول ہے کہ آپ نے فرمایا: تم میں سے کوئی شخص مسجد میں داخل ہو تو اسے کہنا چاہیے: 'اللّٰھم افتح لی ابواب رحمتك' (اے اللہ، میرے لیے اپنی رحمت کے دروازے کھول دے) اور نکلے تو کہنا چاہیے: 'اللّٰھم انی اسئلك من فضلك' (اے اللہ، میں تجھ سے تیری عنایت چاہتا ہوں[۲۴۲])۔

[باقی]

۲۴۲؎ مسلم، رقم ۷۱۳۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ڈاکٹر محمد فاروق خان

مسئلۂ فلسطین

مسئلۂ فلسطین دنیا کا سب سے پیچیدہ، قدیم اور حساس مسئلہ ہے۔ اس لیے کہ اس قضیے میں مذہب، نسل اور کلچر کے تمام تر تضادات اپنی پوری شدت کے ساتھ موجود ہیں ۔ اس مسئلے کو سمجھنے کے لیے مناسب یہ ہے کہ پہلے زمینی حقائق کو سمجھ لیا جائے۔ اس وقت موجودہ اسرائیل کا رقبہ تقریباً اکیس ہزار مربع کلومیٹر اور آبادی انسٹھ (۵۹) لاکھ ہے۔ اس آبادی میں یہودیوں کی تعداد اڑتالیس (۴۸) لاکھ ہے اور عربوں کی تعداد گیارہ (۱۱) لاکھ ہے۔ یعنی بیاسی (۸۲) فی صد یہودی اور اٹھارہ (۱۸) فی صد مسلمان۔

جس علاقے پر اسرائیل نے جون ۱۹۶۷ء کی جنگ میں قبضہ کیا تھا اور جس کے متعلق فلسطینی قیادت کا دعویٰ ہے کہ یہی مستقبل کی فلسطینی ریاست ہے، اس میں سے ایک علاقہ دریائے اردن کے مغربی کنارے سے اسرائیل کی سرحد تک ہے۔ اس علاقے کا رقبہ چھ ہزار مربع کلومیٹر سے کچھ کم ہے اور اس کی آبادی بیس لاکھ ہے۔ دوسرے علاقے کو غزہ کی پٹی کہتے ہیں۔ یہ اسرائیل کی مغربی سرحد، مصر اور بحیرۂ روم میں گھری ہوئی ایک چھوٹی سی پٹی ہے جس کا رقبہ تین سو ساٹھ مربع کلومیٹر ہے اور جس کی آبادی گیارہ لاکھ ہے۔ گویا مجوزہ فلسطینی ریاست میں اکتیس لاکھ فلسطینی رہتے ہیں۔

اس علاقے کی قدیم تاریخ کے مطابق ۲۵۰۰ قبل مسیح میں عرب کے علاوہ کنعان سے لوگ آ کر یہاں آباد ہوئے۔ اسی لیے اس کا قدیم ترین نام ''کنعان'' ہے۔ اس کے بعد ایشیائے کوچک کے علاقوں سے بھی لوگ یہاں آ کر آباد ہوئے۔ انھیں فلسطی کہا جاتا ہے۔ چنانچہ اس علاقے کا یہ نام پڑ گیا۔ جلد ہی یہ دونوں گروہ آپس میں پوری طرح گھل مل گئے۔

حضرت ابراہیم غالباً ۱۹۰۰ قبل مسیح میں اس علاقے میں تشریف لائے تھے۔ یہیں ان کے ہاں حضرت اسحاق پیدا ہوئے۔ حضرت اسحاق کے ایک بیٹے کا نام حضرت یعقوب تھا۔ ان کا لقب ''اسرائیل'' تھا۔ چنانچہ ان سے جو نسل دنیا میں پھیلی، اسے اسرائیل کہا جاتا ہے۔ حضرت یعقوب کے بیٹے حضرت یوسف کے مصر جانے اور وہاں کی سلطنت میں ایک اہم

مقام پانے کی وجہ سے حضرت یعقوب اوران کے باقی گیارہ بیٹے بھی مصرتشریف لے گئے۔ وہاں ایک عرصے تک بنی اسرائیل بہت اہم عہدوں پر فائز رہے، مگر پھر مصر کے اصلی باشندوں یعنی قبطیوں میں ان کے خلاف ردعمل پیدا ہوااوران کی پوری نسل کوغلام بنالیا گیا۔ ایک عرصے تک یہ قوم اسی حالت میں رہی حتیٰ کہ حضرت یوسف کے چارسو سال بعد حضرت موسیٰ پیدا ہوئے، جنھوں نے اس پوری قوم کو لے کر ارض فلسطین کا رخ کیا۔ وہاں کئی صدیوں پر پھیلی ایک لمبی جدوجہد کے بعد سلطنت اسرائیل قائم ہوئی۔ اسی سلطنت کا دور زریں حضرت داؤد اور حضرت سلیمان کا ایک سو بیس سال پر پھیلا ہوا عہد تھا۔ یہودیوں کے مقدس ترین مقام ہیکل سلیمانی کی تعمیر اسی دور میں یروشلم میں ہوئی۔ اس کے بعد ریاست دو حصوں میں بٹ گئی۔ ۵۰ا۳ قبل مسیح میں بابل کے بادشاہ نبوکدنضر نے یروشلم پر حملہ کر کے ہیکل سلیمانی (بیت المقدس) کو برباد کیا اور بنی اسرائیل کو اپنا غلام بنالیا۔

اس کے پچاس برس بعد ایران کے بادشاہ سائرس نے بابل موجودہ عراق کو فتح کیا اور بنی اسرائیل کو واپس جا کر ہیکل دوبارہ تعمیر کرنے کی اجازت دے دی۔ اس دوران میں اور اس کے بعد سن ۷۰ تک یہاں بنی اسرائیل کبھی اقتدار میں رہے، کبھی غلام رہے اور کبھی دوسروں کے تحت نیم خودمختار رہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

سن ۷۰ میں رومیوں نے حملہ کر کے یروشلم کو ایک دفعہ پھر تباہ کیا، یہودیوں کا قتل عام کیا اور زندہ بچ جانے والے یہودیوں کو جلاوطن کر دیا۔ چوتھی صدی میں رومیوں نے عیسائیت قبول کر لی۔ چنانچہ اس پورے علاقے کا سرکاری مذہب بھی عیسائیت ہو گیا۔

تین سو برس بعد یعنی ساتویں صدی عیسوی (سن ۶۳۸) میں حضرت عمر کے وقت میں مسلمانوں نے یروشلم کو فتح کیا۔ اس وقت ہیکل سلیمانی کا پورا علاقہ کھنڈرات بنا ہوا تھا۔ حضرت عمر نے اس علاقے کو صاف کرایا اور اس کے جنوبی حصے میں ایک جگہ نماز پڑھنے کے لیے مخصوص فرمائی۔ یہی آج کی ''مسجد اقصیٰ'' ہے۔

یہاں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کی تاریخ سے متعلق یہودیوں اور قرآن مجید کے موقف کے اختلاف کو سمجھا جائے۔ یہودیوں کے مطابق حضرت یعقوب اور ان کی پوری نسل کو پروردگار نے اپنی چہیتی نسل قرار دیا۔ چنانچہ یہ نسل باقی پوری دنیا پر فضیلت رکھتی ہے۔ اسی نسل کو پروردگار نے فلسطین کا سارا علاقہ حوالے کیا اور ہیکل سلیمانی کو اس کا قبلہ بنایا۔ چنانچہ اس علاقے میں آباد ہونا ان کا حق ہے۔

اس کے برخلاف قرآن مجید کا بیان ہے کہ بنی اسرائیل کو فضیلت ایک خاص مقصد کے لیے دی گئی تھی، وہ یہ کہ وہ خود بھی پروردگار کے احکام پر عمل کریں گے اور پوری دنیا میں توحید کا پیغام پھیلائیں گے۔ چنانچہ جب بھی وہ یہ کام کرتے تھے پروردگار ان پر انعام فرماتا تھا۔ اور جب وہ اس کو پس پشت ڈالتے تھے تو پروردگار ان کو سزا دیتا تھا۔ چونکہ انھوں نے بنی اسرائیل کے آخری پیغمبر حضرت عیسیٰ کو جھٹلایا اور اپنی طرف سے ان کے قتل کے درپے ہوئے۔ اس لیے پروردگار نے ان سے

یہ فضیلت واپس لے لی۔اوراب قیامت تک ان کے لیے دوقوانین ہوں گے۔ایک یہ کہ یہ قوم مستقل مصیبتوں اورتکلیفوں میں مبتلا رہے گی ،البتہ درمیان میں امن اورخوش حالی کے ایسے وقفے آتے رہیں گے جب ان کو پروردگار براہ راست یا کسی دوسری قوم کے ذریعے سے امن اورخوش حالی دے گا۔(سورہ آل عمران۔آیت۱۱۲) دوسرا قانون یہ ہے کہ جب بھی اس قوم کی بھلائیاں اس کی برائیوں سے زیادہ ہوں گی تو پروردگار ان پر رحم فرمائے گا اور جب ان کے ہاں برائیاں غالب ہوں گی تو آخرت کے ساتھ ساتھ انھیں دنیا میں بھی عذاب دیا جائے گا۔(سورہ بنی اسرائیل آیت ۷)

اس بحث کے بعد ہم ایک دفعہ پھر بنی اسرائیل کی تاریخ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

حضرت عمر کے زمانے میں یہ علاقہ فتح ہونے کے بعد اگلے ساڑھے چار سو برس تک مسلمانوں کے قبضے میں رہا۔ ۱۰۷۸ء میں سلجوقی ترکوں نے یروشلم پر قبضہ کیا۔ان کے بیس سالہ دور حکومت میں عیسائی زائرین کے ساتھ ناروا سلوک کیا گیا جس کے ردعمل میں یورپ میں غم وغصے کی لہر دوڑ گئی اور ایک متحد عیسائی لشکر نے یروشلم پر قبضہ کرلیا۔اسی کو تاریخ میں صلیبی جنگیں کہتے ہیں۔ یہ واقعہ ۱۰۹۹ء کا ہے۔

اٹھاسی سال کے بعد اکتوبر ۱۱۸۷ء میں مسلمانوں نے صلاح الدین ایوبی کی قیادت میں دوبارہ یروشلم پر قبضہ کرلیا۔ اگرچہ اس کے بعد مزید سو سال تک مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان لڑائیاں ہوتی رہیں، تاہم مسلمانوں کا قبضہ برقرار رہا۔ گویا عیسائیوں کے اٹھاسی سالہ اقتدار کے بعد یروشلم پر اگلے آٹھ سو برس یعنی پہلی جنگ عظیم تک مسلمانوں کا قبضہ رہا۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

۱۵۱۷ء میں عثمانی ترکوں نے فلسطین پر قبضہ کرلیا اور اگلے چار سو برس تک یہ علاقہ عثمانی سلطنت کا حصہ رہا۔ یہ سلطنت بہت مضبوط بنیادوں پر قائم تھی۔تاہم ہر آمرانہ حکومت کی طرح اس میں آہستہ آہستہ خرابیاں در آتی گئیں۔کرپشن،عیاشی اور سازشیں پروان چڑھتی گئیں۔اجتماعی اخلاقیات دن بدن گرتی گئیں۔ جہاں یورپ جمہوریت اور سائنس کی نعمتوں سے بہرہ ور ہورہا تھا،عثمانی سلطنت نے ان دونوں کے لیے اپنے دروازے بند کرلیے اور ہر سلطان نے از کار رفتہ طریقوں سے اپنی حکومت بچانے کی جدوجہد ہی کو اپنا مقصد سمجھا۔ چنانچہ یہ سلطنت رفتہ رفتہ کمزور ہوتی گئی۔حکومت کا سارا نظام قرضوں کے سہارے چلنے لگا۔ یورپی ممالک سے لیے گئے ان قرضوں کی ادائیگی کے لیے جب صوبوں پر اضافی ٹیکس لگائے گئے تو اکثر صوبوں نے بغاوت کردی۔حتیٰ کہ اکثر مقبوضہ جگہیں ترکی کے ہاتھ سے نکل گئیں۔اس پورے دور میں مذہبی طبقہ عام طور پر سلاطین کا حامی رہا۔ چنانچہ عام لوگ ،سلاطین اور مذہبی طبقہ ، دونوں کے خلاف ہوگئے۔چنانچہ ۱۹۰۸ء میں سلطان عبدالحمید کو برطرف کر دیا گیا اور ایک موثر قوم پرست تنظیم ''ینگ ٹرک'' یعنی نوجوان ترکوں نے اقتدار سنبھال لیا۔اس حکومت نے ایک فاش غلطی یہ کی کہ ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم کی ابتدا سے جرمنی سے خفیہ معاہدہ کرلیا اور اتحادی افواج جن میں برطانیہ،فرانس،روس اور بعد میں امریکہ بھی شامل ہوگیا، کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔اور روسی بندرگاہوں پر بمباری شروع کردی۔ یہ ایک بھیانک غلطی تھی۔ترکی کے لیے سب سے اچھی پالیسی غیر جانب داری کی تھی۔ بہرحال اس اعلان

جنگ کے بعد اتحادی افواج نے ترک مقبوضات پر بھی حملہ شروع کیا اور یروشلم دسمبر ۱۹۱۷ء میں برطانوی فوج کے قبضے میں چلا گیا۔ یروشلم کے تمام مسلمان باشندوں نے ترکی حکومت کی مخالفت میں برطانوی جنرل ایلن بی کا ایک ہیرو کی طرح استقبال کیا۔

یہاں یہ دیکھنا ضروری ہے کہ اس قبضے سے پیش تر یہودیوں کی کیا حالت تھی، عالم عرب کی کیا صورت حال تھی اور بڑی طاقتیں کیا کھیل کھیل رہی تھیں۔

۷۰ء میں جب رومیوں نے یہودیوں کو جلاوطن کر دیا۔ تو اس کے بعد یہ قوم اٹھارہ سو سال تک تتر بتر رہی۔ اسے یہودیوں کی اصطلاح میں 'Diaspora' کہتے ہیں۔ اس دوران میں اکثر جگہوں میں یہودیوں پر مظالم ڈھائے جاتے رہے۔ تاہم سپین کے مسلم عہد اور شمالی یورپ کے بعض ممالک میں ان سے اچھا سلوک کیا گیا۔ صلیبی جنگوں کے دوران میں عیسائیوں نے مسلمانوں کے خلاف لڑنے کے ساتھ ساتھ یہودیوں کا بھی خوب قتل عام کیا۔ عثمانی ترکوں کے عہد میں بھی ان کے ساتھ مناسب سلوک کیا گیا۔ مغربی یورپ میں جمہوریت آنے کے ساتھ ساتھ یہودیوں کے ساتھ سلوک میں بھی بہتری آتی گئی۔ تاہم روس اور جرمنی میں ان کے ساتھ بہت برا سلوک روا رکھا گیا۔ زار روس ان کا سخت مخالف تھا۔ سترھویں صدی کے لگ بھگ یہودیوں میں اپنی کم مائیگی اور بے چارگی کا احساس پیدا ہونے لگا۔ اور مختلف مقامات پر یہودیوں نے اپنی مقامی تنظیمیں بنانی شروع کر دیں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

یوں تو یہودیوں میں یہ احساس بھی سترھویں صدی سے ہی پیدا ہو گیا تھا کہ ان کا اصل وطن فلسطین ہے جہاں انھیں واپس جانا چاہیے، مگر اس کو باقاعدہ ایک تحریک کی شکل جرمنی کے ایک مشہور دانش ور اور وکیل تھیوڈر ہرزل نے دی جس نے ۱۸۹۵ء میں صیہونیت (Zionism) کے نام سے یہ شروع کی۔ زایان یا صیہون دراصل یروشلم کے قریب ایک پہاڑی کا نام ہے۔ ابتدا میں یہ خیال بھی تھا کہ دنیا میں کہیں بھی کوئی ایسی جگہ مل جائے جہاں یہودی امن سے رہ سکیں اور اس ضمن میں نظر انتخاب یوگنڈا پر گئی۔ تاہم یہودیوں کی اکثریت نے اسے نامنظور کر کے فلسطین ہی کو اپنا مقصد قرار دیا۔ ۱۸۸۱ء میں فلسطین میں صرف چوبیس ہزار یہودی تھے۔ روس میں زار کے ظلم سے بچنے کے لیے بہت سے یہودیوں نے روس چھوڑ کر فلسطین کا رخ کیا۔ چنانچہ ۱۹۱۴ء میں فلسطین میں پچاسی ہزار یہودی آباد تھے۔ اس وقت وہاں فلسطینیوں کی تعداد چھ لاکھ تھی۔

اس وقت بین الاقوامی صورت حال کیا تھی۔ اسے جاننا بھی ضروری ہے۔ انیسویں صدی میں سلطنت برطانیہ سب سے بڑی طاقت تھی، مگر اس صدی کے دوسرے آخر میں جرمنی بھی ایک بڑی طاقت کی حیثیت سے ابھرا۔ یہ دونوں اور یورپ کی باقی طاقتیں صنعتی اعتبار سے ترقی کے منازل طے کر رہی تھیں اور ظاہر ہے کہ ان کے درمیان خام مال، تیار مال کی فروخت اور دوسرے وسائل کے لیے مقابلہ لازمی تھا۔ چنانچہ ایک طرف برطانیہ، فرانس اور روس کا اتحاد بن گیا اور دوسری طرف جرمنی، اٹلی، آسٹریا اور ہنگری کا اتحاد بن گیا۔ اس منظرنامے میں ترکی کی کوئی حیثیت ہی نہ تھی۔ اس لیے کہ وہ ہر اعتبار سے پس ماندہ تھا

اور اسی لیے یورپ کا ''مرد بیمار'' کہلاتا تھا۔ چنانچہ جب پہلی جنگ عظیم ۱۹۱۴ء میں چھڑ گئی تو ترکی نے بلا ضرورت اس میں جرمنی کا ساتھ دیا اور روسی بندرگاہوں پر حملہ کر کے اپنی طرف سے جنگ کی ابتدا بھی کر دی۔ چنانچہ برطانیہ اور اس کی اتحادی افواج نے ترکی مقبوضات، جن میں فلسطین بھی شامل تھا، کو اپنا ٹارگٹ بنا لیا۔

اب دیکھیے کہ اس وقت عالم عرب کی صورت حال کیا تھی۔ ۱۵۱۷ء میں عثمانی ترکوں نے فلسطین پر قبضہ کر لیا تھا۔ اسی کے لگ بھگ مصر سمیت مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ بھی ترکوں کے قبضے میں چلے گئے۔ عربوں میں قبائلی معاشرت تھی اور ترکوں کا رویہ ان کے ساتھ حاکمانہ تھا۔ چنانچہ جگہ جگہ بغاوتیں پھوٹتی رہیں۔ قوم پرستی کا جذبہ بڑھتا رہا اور ترک انتہائی بے رحمی کے ساتھ مختلف بغاوتوں کو کچلتے رہے۔ چنانچہ پورے عالم عرب میں بلحاظ مجموعی ترکوں کے خلاف نفرت کی ایسی فضا پیدا ہو گئی کہ وہ ترکوں کے خلاف ہر طاقت کا خیر مقدم کرنے کے لیے تیار تھے۔

چنانچہ جب پہلی جنگ عظیم چھڑی تو برطانیہ نے ترکی کو شکست دینے کے لیے ایک پلان بنایا۔ اس پلان کے تحت برطانیہ نے ایک طرف دنیا بھر کے یہودیوں کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی جو اب بہت مال دار ہو چکے تھے اور جن کے پیسے اور علم و ہنر کی برطانیہ کو سخت ضرورت تھی۔ دوسری طرف برطانیہ نے ان عرب طاقتوں کی حمایت کا اعلان کیا جو ترکوں سے برسر پیکار تھے۔ کہا جاتا ہے کہ کیمسٹری کا یہودی پروفیسر ڈاکٹر وائزمین جو اس وقت صیہونی تحریک کا سربراہ تھا، نے برطانوی حکومت کو چند ایسی ایجادات بنا کر دیں جن سے جنگ میں برطانیہ کا پلہ بھاری ہو گیا۔ اس کے عوض اس نے برطانوی حکومت سے یہ انعام مانگا کہ وہ یہ وعدہ کرے کہ جنگ عظیم میں کامیابی کی صورت میں فلسطین میں یہودیوں کا ایک قومی وطن قائم کیا جائے گا۔ چنانچہ نومبر ۱۹۱۷ میں وزیر خارجہ لارڈ بالفور نے ایک خفیہ خط کے ذریعے سے یہ وعدہ کر لیا۔ اس خط کو عرف عام میں ''اعلان بالفور'' کہا جاتا ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

دوسری طرف برطانیہ نے جنگ عظیم کے دوران میں سرزمین حجاز (یعنی مکہ و مدینہ) کے حاکم حسین ابن علی، جسے عام طور پر ''شریف حسین آف مکہ'' کہا جاتا ہے، کو یہ پیش کش کی کہ اگر وہ ترک عثمانی حکومت کے خلاف بغاوت کر کے اپنی آزادی کا اعلان کرے تو برطانوی حکومت اس کی حمایت اور مدد کرے گی۔ چنانچہ شریف حسین نے یہی کیا اور ترک حکومت کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ یہ بڑی عجیب لیکن اہم بات ہے کہ ۲۴ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو مصر میں برطانوی ہائی کمشنر سر ہنری مک موہن نے شریف حسین کے نام خط میں تمام عرب آبادی کی آزادی کا وعدہ کیا تھا ''ماسوائے شام کے چند مغربی اضلاع کے''۔ یہی وہ بات ہے جس کی بنیاد پر برطانیہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس نے اسرائیل کے قیام کے اپنے ممکنہ عزم کو کبھی خفیہ نہیں رکھا۔ تاہم اس کے بعد برطانیہ اور فرانس نے مئی ۱۹۱۶ میں ایک خفیہ معاہدہ کیا جس کو سائی کس پائی کاٹ معاہدہ کہا جاتا ہے جس کے مطابق جنگ کے بعد لبنان اور شام فرانس کو ملنا تھا اور عراق، اردن اور فلسطین برطانیہ کو۔

برطانیہ کے اس معاہدے کا راز ۱۹۱۷ء میں روسی حکومت نے اس وقت افشا کیا جب جنگ عظیم اول کے درمیان میں ہی

روس میں کمیونسٹوں نے زار کا تختہ الٹ کر اپنی حکومت قائم کر لی۔ اعلان بالفور کا بھی اسی طریقے سے پتا چلا۔

ادھر یہ حال تھا اور ادھر عرب، انگریزوں کے گن گا رہے تھے۔ دسمبر ۱۹۱۷ میں جب برطانوی افواج یروشلم پہنچیں تو یروشلم کے تمام شہریوں نے شہر سے باہر آ کر ان کا والہانہ استقبال کیا، حالانکہ اس وقت تک برطانیہ کے یہودیوں سے کیے گئے تمام وعدے سامنے آ چکے تھے۔

اس کے بعد اگلے تیس برس میں برطانیہ نے فلسطین میں یہودی آباد کاری کے لیے جائز و ناجائز ہتھکنڈوں سے کام لیا۔ تاہم برطانیہ کی اس کوشش میں بہت سے عربوں نے بھی اپنا کردار یوں ادا کیا کہ شام اور لبنان میں بیٹھے ہوئے تمام غیر حاضر زمین داروں نے منہ مانگی قیمت پر اپنی زمینیں یہودیوں کو فروخت کر دیں۔ بہت سے فلسطینیوں نے بھی اپنی زمین یہودیوں کو بیچ دی اگرچہ بہت سے لوگوں اور اہل علم نے انھیں اس سے روکا۔

جب یہودیوں کی آبادی کافی بڑھ گئی تب وہاں کے مسلمانوں کو ہوش آیا اور ۱۹۳۶ء سے لے کر ۱۹۳۹ء تک فلسطینیوں نے برطانوی حکومت کے خلاف بغاوت کی، مگر اس بغاوت کے مقابلے میں برطانوی اور یہودی اکٹھے تھے، چنانچہ بغاوت کچل دی گئی۔ یہ بھی ایک دل خراش حقیقت ہے کہ اس وقت بھی فلسطینی آپس میں تقسیم تھے جب کہ یہودی پہلے دن سے ہی ایک تنظیم ''جیوش ایجنسی'' کے تحت منظّم تھے، اس کے ساتھ ہی یہودیوں نے ایک منظّم اور تربیت یافتہ فوج بھی تیار کر لی۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس مملکت کے قیام کے لیے یہودیوں نے جتنی قربانی دی، اس کی تاریخ میں مثالیں بہت کم ہیں۔ مختلف حکومتوں کے خوف سے بھاگنے والے تو خیر آ ہی رہے تھے، لیکن بہت بڑے لوگ بھی اپنی آرام دہ زندگی چھوڑ کر فلسطین کے صحراؤں میں آ کر اپنے مستقبل کی مملکت کی تعمیر میں جت گئے۔

فلسطین میں یہودیوں کی آبادی آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔ ساری دنیا سے یہودی اپنے مستقبل کے قومی وطن کی خواہش میں یہاں آتے گئے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران میں جرمنی سے بھاگ کر آنے والوں کی تعداد میں بہت اضافہ ہوا، کیونکہ ایک اندازے کے مطابق ہٹلر نے چھ لاکھ یہودیوں کو قتل کر دیا تھا اور باقی جان بچا کر فلسطین بھاگ آئے۔ ۱۹۴۸ء میں یعنی اسرائیل کے قیام کے وقت وہاں سات لاکھ اٹھاون ہزار یہودی بس گئے تھے۔ جب برطانیہ نے دیکھا کہ اب وہاں ایک یہودی وطن بن سکتا ہے تو اس نے اس پورے علاقے کو اقوام متحدہ کے حوالے کر دیا۔ اس وقت صورت حال یہ بنی کہ امریکہ اور روس سمیت تمام طاقت ور ممالک اسرائیل کے حامی تھے۔ چنانچہ نومبر ۱۹۴۷ میں اقوام متحدہ نے ایک قرارداد کے ذریعے سے فلسطین کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کا اعلان کیا۔ اسرائیل کو کل رقبے کا چھپن (۵۶) فی صد دیا گیا، حالانکہ یہودیوں کی آبادی اس وقت کل آبادی کی ایک تہائی تھی اور فلسطینی ریاست کو چوالیس (۴۴) فی صد دیا گیا حالانکہ فلسطینیوں کی آبادی دو تہائی تھی۔ یہ صریحاً ایک ناجائز تقسیم تھی۔ چنانچہ فلسطینیوں اور اردگرد کے عرب ممالک نے اسے ماننے سے انکار کر دیا۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

راقم کے نزدیک اس وقت فلسطینیوں اور دیگر عرب ممالک کا یہ انکار ایک غلطی تھی۔ اسی لیے کہ یہ انکار زمینی حقائق کے خلاف تھا اور اس سے فلسطینیوں کو مزید نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ اس وقت تمام بڑی طاقتیں اسرائیلی ریاست کے قیام کے حق میں تھیں۔ یہودی، مسلمانوں کی نسبت بہت زیادہ طاقت ور اور پرجوش تھے۔ اس کے مقابلے میں مسلمان ممالک کمزور اور آپس میں ایک دوسرے سے دشمنی رکھنے والے تھے۔ بات یہ ہے کہ اپنا مقصد کبھی نہیں بھولنا چاہیے، لیکن سمجھوتا ہمیشہ پیش آمدہ حالات کی بنیاد پر کرنا چاہیے اور اس وقت کا صبر سے انتظار کرنا چاہیے جب حالات ایک نئی کروٹ لے لیں۔ سمجھوتا کبھی بھی منصفانہ نہیں ہوا کرتا، بلکہ یہ ہمیشہ عملی ہوا کرتا ہے۔

یہ بات بھی بہت اہم ہے کہ اردن کا شاہ عبداللہ بھی فلسطینی ریاست کا سخت مخالف تھا۔ اس لیے کہ اس سے اس کو اپنی ریاست کے لیے خطرہ محسوس ہوتا تھا۔ چنانچہ اس نے اسرائیلی حکومت سے خفیہ مذاکرات کر کے فلسطینی ریاست رکوانے اور اس کے بعض حصوں پر خود قبضہ کرنے اور بعض حصوں پر اسرائیلیوں کو قبضہ کرنے کی اجازت دینے کا خفیہ سمجھوتا کر لیا۔

۱۴ مئی ۱۹۴۸ کو آخری برطانوی رجمنٹ کے رخصت ہوتے ہی اسرائیل نے اپنی آزادی کا اعلان کر لیا۔ لیکن فلسطین نے اپنی آزادی کا اعلان نہیں کیا۔ حالانکہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ فلسطینی اپنی چوالیس فی صد زمین پر آزادی کا اعلان کرتے اور بقیہ زمین حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کرتے۔ اس کے بجائے ارد گرد کے چار عرب ممالک شام، اردن، مصر اور عراق نے مل کر اسرائیل کے خلاف اعلان جنگ کر لیا۔ یہ تمام افواج بہت کمزور، نیم تربیت یافتہ اور مورال کے لحاظ سے انتہائی پست تھیں۔ یہ سب آپس میں ایک دوسرے کے بھی دشمن تھے اور ان کے بہت سے کمانڈر اسرائیلیوں سے ملے ہوئے تھے۔ چنانچہ ان کو شکست فاش ہوئی۔ اسرائیل نے مزید علاقے پر قبضہ کر لیا۔ اب اس کے پاس ستتر (۷۷) فی صد علاقہ تھا۔ مغربی کنارے کو اردن نے اور غزہ کی پٹی کو مصر نے اپنے قبضے میں کر لیا۔ گویا فلسطینی ریاست نہ بنانے دینے کے جرم میں اسرائیل کے ساتھ یہ دونوں ممالک بھی شریک تھے۔ حالانکہ اگر یہ دونوں ممالک اپنے زیر قبضہ علاقوں میں فلسطینی ریاست بنا دیتے تو ساری دنیا اس کو فوراً تسلیم کر لیتی اور اسرائیل سے مزید گفت و شنید نہایت آسان ہوتی۔

عرب ممالک نے ایک اور طریقہ سے بھی اسرائیل کو بڑا فائدہ پہنچایا۔ وہ یوں کہ ۱۹۴۸ء میں پہلے کے اسرائیل میں یورپ سے آنے والے اعلیٰ تعلیم یافتہ یہودی شامل تھے۔ ان کو اشکینازے (Ashkeneze) کہا جاتا ہے۔ لیکن ۱۹۴۸ء کے بعد آنے والے لاکھوں یہودیوں میں سے اکثر کا تعلق مشرقی ممالک خصوصاً مسلم عرب ممالک یعنی تیونس، مراکش، مصر وغیرہ سے ہے۔ ان کو سیفارڈم (Sephardim) کہا جاتا ہے۔ اسرائیل میں اب انھی مشرقی یہودیوں کی اکثریت ہے۔ عرب ممالک چاہتے تو ان یہودیوں کے بدلے ریاست فلسطین کے لیے گفت و شنید کر سکتے تھے، مگر ان کے ہاں اس امر کا کوئی شعور نہ تھا۔

اکتوبر ۱۹۵۶ء میں اسرائیل نے صحرائے سینا اور غزہ کی پٹی پر حملہ کر کے انھیں دو دن کے اندر فتح کر لیا۔ دو دن بعد برطانیہ

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.org

اور فرانس کی فوجیں، پہلے سے اسرائیل کے ساتھ طے شدہ منصوبے کے تحت نہر سویز میں اتر گئیں اور اس پر قبضہ کر لیا۔اس مداخلت پر امریکہ نے سخت ردعمل کا اظہار کیا اور اس کے الٹی میٹم کے ذریعے سے قابض افواج یہ جگہیں خالی کرنے پر مجبور ہو گئیں۔اس سے عربوں خصوصاً مصر کو یہ سبق حاصل ہونا چاہیے تھا کہ اسرائیل کے مقابلے میں وہ کتنے کمزور ہیں اور اپنی کمزوری دور کرنے کی طرف توجہ دینی چاہیے تھی، مگر اس کے برعکس اس پورے عرصے کے دوران میں تمام عرب ریاستیں آپس میں لڑتی بھڑتی رہیں۔مصر اور سعودی عرب کی افواج کئی برس تک یمن میں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا رہیں۔کچھ عرب ممالک امریکی کیمپ میں شامل تھے اور کچھ روس کے گن گاتے تھے۔بذات خود روسی اور امریکہ، دونوں اسرائیل کے پورے پورے پشتی بان تھے۔

جون ۱۹۶۷ میں ایک اور عرب اسرائیل جنگ ہوئی۔اس وقت مصر کے صدر جمال عبدالناصر تھے۔جو بلا ضرورت نعرے بازی، دھمکیوں اور پر جوش تقریروں میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ان کا تکیہ کلام ہی یہ تھا کہ ہم اسرائیل کو اٹھا کر بحیرہ روم میں غرق کر دیں گے۔مئی کے اواخر اور جون کے شروع میں انھوں نے ہر جگہ یہ کہنا شروع کیا کہ ہم اسرائیل سے جنگ کے لیے تیار ہیں اور بس اسرائیل پر ہمارا حملہ ہوا ہی چاہتا ہے۔اس کے ساتھ ہی انھوں نے بحیرۂ روم میں تمام بحری جہازوں کی آمدورفت رکوا دی۔اقوام متحدہ کے امن مشن کو، جو اسرائیل اور مصر کی سرحدات پر موجود تھا، باہر نکال دیا اور کہا کہ ہم اسرائیل پر حملے کے لیے اپنی افواج جمع کر رہے ہیں۔

بجائے اس کے کہ عرب ممالک اسرائیل پر حملہ کرتے، پانچ جون ۱۹۶۷ کو اسرائیل نے نہایت خاموشی سے تینوں عرب ملکوں یعنی مصر، شام اور اردن پر بیک وقت حملہ کر دیا۔ایک دن کے اندر اندر اس نے ان تینوں ممالک کے تمام ہوائی جہازوں کو ختم کر دیا اور تمام ہوائی اڈے تباہ کر دیے۔چھ دن کے اندر اندر اسرائیل نے مصر سے ساری غزہ کی پٹی اور صحرائے سینا چھین لیا۔صحرائے سینا کا رقبہ ساٹھ ہزار مربع کلومیٹر سے زیادہ ہے یعنی بذات خود اسرائیل کے رقبے سے تین گنا زیادہ۔خود صدر ناصر کے مطابق اس وقت سویز کینال سے لے کر قاہرہ تک مصری فوج کا ایک سپاہی بھی موجود نہ تھا۔اور اگر اسرائیلی فوج چاہتی تو آسانی کے ساتھ قاہرہ پر قابض ہو سکتی تھی۔اس کے ساتھ اسرائیل نے اردن سے دریائے اردن کا سارا مغربی کنارہ بشمول یروشلم اپنے قبضے میں کر لیا اور شام سے گولان کی پہاڑیاں، جن کا رقبہ ایک ہزار ایک سو پچاس مربع کلومیٹر ہے، چھین لیا۔گویا اس جنگ میں اسرائیل نے سارے کے سارے فلسطین پر قبضہ کر لیا۔

چھ اکتوبر ۱۹۷۳ کو مصر کے صدر انور السادات اور شام نے بیک وقت اسرائیل سے اپنے مقبوضہ علاقے واگزار کرانے کے لیے اس پر حملہ کیا۔ابتدا میں ان دونوں کو کامیابی ہوئی، مگر امریکہ کی طرف سے ہنگامی بنیادوں پر اسرائیل کی بہت بڑی اسلحی امداد نے جنگ کا پانسہ پلٹ دیا۔شام کے محاذ پر اسرائیل نے مزید علاقے پر قبضہ کر لیا اور سویز کے محاذ پر اس کی افواج مغربی ساحل پر بھی اتر گئیں۔اسی جنگ پر بعد میں تبصرہ کرتے ہوئے انور السادات نے کہا کہ اس جنگ سے مجھے یہ احساس

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

ہو گیا کہ میں اسرائیل سے تو لڑ سکتا ہوں، مگر امریکہ سے نہیں لڑ سکتا۔

۱۹۷۸ء میں سادات نے امریکی ثالثی کے ذریعے سے کیمپ ڈیوڈ میں اسرائیل سے سمجھوتا کیا جس کے تحت اسرائیل نے صحرائے سینا خالی کر دیا۔ گویا سادات نے مصر کا علاقہ تو واپس لے لیا، مگر فلسطین کا جو پورا علاقہ اس کے پاس تھا یعنی غزہ کی پٹی اور جس پر اسرائیل نے ۱۹۶۷ء میں قبضہ کر لیا تھا، اسے اس نے اسرائیل ہی کے قبضے میں رہنے دیا۔ یہ ہے فلسطین کے کاز سے عربوں کی کمٹ منٹ۔

یوں تو فلسطین کی لاتعداد سیاسی اور عسکری تنظیمیں قائم ہوئیں، مگر ان میں سب سے اہم پی ایل او ہے۔ جس کا قیام ۱۹۶۴ء میں عمل میں لایا گیا تھا۔ اس کے بنیادی چارٹر میں یہ بات شامل تھی کہ سارا فلسطین (بمع اسرائیل) فلسطینیوں کا ہے اور یہودیوں کا اس پر کوئی حق نہیں۔ اس تنظیم کے عسکری بازو کو ''فلسطین لبریشن آرمی'' کا نام دیا گیا۔ الفتح کی بنیاد ۱۹۵۷ء میں رکھ دی گئی تھی۔ ۱۹۶۷ء سے لے کر ۱۹۷۰ء تک مختلف مسلح فلسطینی تنظیموں نے اسرائیل کے خلاف بہت سی گوریلا کارروائیاں کیں۔ ستمبر ۱۹۷۰ اور جولائی ۱۹۷۱ میں ان مسلح تنظیموں کی اردن کی افواج سے لڑائی ہو گئی جس کے نتیجے میں انھیں اردن سے نکال دیا گیا۔ اسی طرح لبنانی فوج کے ساتھ لڑائی کے بعد وہاں بھی ان کا خاتمہ کر دیا گیا۔ اس کے بعد مصر اور شام نے بھی اپنی سرحدوں کی طرف سے ان کی مسلح کارروائیوں پر پابندی لگا دی۔ ۱۹۸۷ء میں اسرائیل نے لبنان میں موجود فلسطینی گوریلوں کا خاتمہ کرنے کے لیے اسی (۸۰) دن تک ایک آپریشن کیا جس کے بعد ایک معاہدے کے تحت چھ ہزار فلسطینی جنگجوؤں کو یمن، تیونس، الجزائر اور سوڈان کے دور دراز کیمپوں میں منتقل کر دیا گیا۔ ان تمام ناکامیوں کی وجہ سے پی ایل او نے اسرائیل کو ختم کرنے کا نکتہ واپس لے لیا۔ اور اس کے ساتھ پرامن طریقے سے ایک فلسطینی ریاست کے قیام کو اپنا مقصد بنا لیا۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ عسکریت کیوں ناکام ہوئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پی ایل او ایک تنظیم ضرور تھی، بلکہ تقریباً ایک سو تنظیموں کا اتحاد تھی، مگر اس کی پشت پر کوئی ایسی ریاست نہیں تھی جو کھلم کھلا اس کو اپناتی اور اسرائیل کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ رکھتی۔ اس لیے ایک ایک کر کے تمام عرب ممالک نے اس کو اپنے سے دور کیا۔ یعنی 'disown' کیا۔ یہ تنظیم اپنے مسلح حملوں کے ذریعے سے زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتی تھی کہ اسرائیل کو تنگ کرے۔

دوسری طرف پی ایل او کو اس اتحاد اور ایک متفقہ لیڈر یاسر عرفات چننے کا بڑا سیاسی فائدہ پہنچا۔ ۱۹۷۴ء میں یاسر عرفات نے فلسطین کے نمائندے کی حیثیت سے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی سے خطاب کیا۔ اقوام متحدہ نے فلسطین کو ایک قوم تسلیم کیا اور ان کے حق خود ارادیت کے لیے کئی قراردادیں منظور کیں۔

۱۹ اگست ۱۹۹۳ کو اسرائیل اور پی ایل او کے درمیان ''اوسلو امن معاہدہ'' ہوا۔ اس معاہدہ پر گواہوں کی حیثیت سے امریکہ اور روس کے وزرائے خارجہ نے دستخط کیے۔ یہ معاہدہ دو سال کے خفیہ مذاکرات کے بعد طے پایا۔ اس معاہدے کا

فائدہ یہ ہوا کہ اسرائیل نے باضابطہ طور پر فلسطینی ریاست کو نظری اعتبار سے تسلیم کر لیا۔ اس معاہدے کا منفی نکتہ یہ ہے کہ اس میں ایک پیچیدہ اور بہت آہستہ رو طریقۂ کار کے مطابق فلسطینی اتھارٹی کو اختیارات تفویض کیے جانے تھے۔ ظاہر ہے کہ ایک ایسے علاقے میں جو انتہائی حساس ہو جہاں بیسیوں نقطۂ نظر کے لوگ بستے ہوں، جہاں لاکھوں لوگوں کے پاس اسلحہ ہو، جہاں پر ہر کوئی دوسرے کو شک کی نگاہ سے دیکھتا ہو، وہاں ایک تنظیم کو بہت محدود قسم کے اختیارات تفویض کیے جائیں اور اس سے یہ توقع رکھی جائے کہ ان اختیارات سے کام لے کر اپنے لوگوں کو قابو کریں گے۔ ایسی توقع رکھنا بالکل غلط ہے۔ اس سے حالات مزید پیچیدہ ہوں گے اور نئے نئے مسائل جنم لیں گے۔ اس کے بجائے صحیح طریقۂ کار یہ تھا کہ فلسطینی وفد اس بات پر اصرار کرتا کہ ان کو مغربی کنارے اور غزہ کی پٹی پر مکمل اختیار دے کر ان کی ریاست تسلیم کر لی جائے اور اسی طریقے سے یہ ریاست وجود میں آ جائے، جس طرح ریاستیں وجود میں آیا کرتی ہیں۔ بے شک یہ مذاکرات کامیاب نہ ہوتے، لیکن اس موقف سے انحراف نہ کیا جاتا۔

راقم کا تجزیہ یہ ہے کہ اسرائیل جانتا تھا کہ اتنے پیچیدہ طریقۂ کار کا کیا نتیجہ نکلتا ہے، لیکن اس نے جان بوجھ کر فلسطینی وفد کو پھنسایا کہ فلسطینی اتھارٹی ناکام ہو جائے اور آخری حل میں اسرائیل کو مزید رعایتیں اور غرب اردن کی مزید زمین مل جائے۔ فلسطین وفد اس جال میں پوری طرح پھنس گیا۔ اس معاہدے کا دوسرا منفی نکتہ یہ تھا کہ اس میں حساس ترین مسئلے یعنی یروشلم کی تقسیم اور دیوار گریہ اور قبۃ الصخرۃ کے مستقبل کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا گیا تھا۔ ان کے بغیر بھلا مذاکرات کا کیا مطلب تھا۔ چنانچہ اس معاہدے پر عمل درآمد میں دونوں فریقوں کی طرف سے ناکامی ہوئی اور حالات مزید بگاڑ کی طرف چلے گئے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

حماس اور پہلا انتفاضہ

فلسطین کی بیش تر تنظیمیں اور بذات خود پی ایل او سیکولر تنظیمیں ہیں۔ دسمبر ۱۹۸۷ میں حماس کے نام سے ایک ایسی مزاحمتی تحریک سامنے آئی جو اپنے جذبات کی آب یاری اسلام سے کرتی ہے۔ اس کے رہنما جسمانی طور پر معذور، لیکن انتہائی باصلاحیت شیخ احمد یاسین ہیں۔ اس تنظیم کے کارکن اجتماعی اخلاقیات کے اعتبار سے دوسری تنظیموں سے بہت ممتاز تھے۔ اس لیے اسے جلد مقبولیت حاصل ہوگئی۔ اگلے سال اس تحریک نے انتفاضہ یعنی مزاحمت شروع کی۔ اس کی مزاحمت کا انداز اچھوتا تھا۔ بچوں، خواتین اور نوجوانوں کے پاس چھوٹے چھوٹے پتھر ہوتے جنھیں وہ اسرائیلی ٹینکوں اور بکتر بند گاڑیوں پر پھینکتے۔ ظاہر ہے اس سے ان ٹینکوں کا تو کچھ نہ بگڑتا، مگر اس سے اس مزاحمت کی مظلومیت، اس کا برحق ہونا اور اس کا عزم بھرپور طریقے سے ظاہر ہو جاتا۔ یہ بین الاقوامی طور پر اپنے آپ کو منوانے اور عوام کو متحد، منظّم اور پرعزم رکھنے کا نہایت اچھا ذریعہ تھا۔ یہ تحریک اصلاً عدم تشدد کی تحریک تھی۔ اسی لیے ہمیشہ اس تحریک کے لوگ تو شہید ہوتے رہے، لیکن اس نے کسی اسرائیلی

بچے یا خاتون پر تشدد نہیں کیا۔ اس سے اس تحریک کی اخلاقی ساکھ پوری دنیا میں بیٹھ گئی۔

راقم کے نزدیک یہ اپنی اصل میں نہایت قابل قدر تحریک تھی۔ تاہم اس کے دو اجزا صحیح نہیں تھے۔ ایک یہ کہ اس تحریک کا مقصد بھی یہی تھا کہ اسرائیل کو جڑ سے اکھاڑ اجائے۔ درپیش صورت حال میں نا قابل عمل بات تھی۔ دوسرا یہ کہ ٹینک کو پتھر مارنا بذات خود عدم تشدد ہے، لیکن اس میں تشدد کے جراثیم موجود تھے۔ یہ اقدام کسی بھی وقت اس سے کسی اگلے قدم میں تبدیل ہو سکتا ہے۔ عدم تشدد کی صحیح حکمت عملی موجود دنیا میں وہی ہے جو قائداعظم، گاندھی اور نیلسن منڈیلا نے استعمال کی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس تحریک کے پہلے چار سالوں میں اس میں عوام کی شرکت اور اس کی اخلاقی ساکھ فقید المثال رہی۔ لیکن آخری دو سالوں میں اس نے بھی دوسری تنظیموں کی طرح مسلح اقدامات شروع کر دیے جس سے اس میں عوامی شمولیت کم ہو گئی۔ چنانچہ ۱۹۹۴ء کے لگ بھگ یہ تحریک مدھم پڑ گئی۔ اگرچہ حماس کی عوامی مقبولیت اب بھی موجود ہے جو پی ایل او کے بعد دوسرے درجے پر ہے۔

فلسطینی اتھارٹی کے نام نہاد اقتدار

۵ جولائی ۱۹۹۴ کو فلسطینی انتظامیہ نے دستوری حلف اٹھایا۔ اس کے بعد فلسطینی انتظامیہ کے سامنے چند بڑے مسائل نے جنم لیا۔ پہلا مسئلہ یہ تھا کہ حماس اور اسلامی جہاد غرب اردن اور اسرائیل کے اندر مسلح کارروائیاں کر رہی تھیں۔ اسرائیل نے مطالبہ کیا کہ ان کارروائیوں کو روک دیا جائے۔ فلسطینی اتھارٹی کے پاس ان کو روکنے کی کوئی طاقت نہیں تھی چنانچہ اسرائیل نے اس کو بہانہ بنا کر اسے اوسلو معاہدے پر عمل درآمد میں سب سے بڑی رکاوٹ قرار دیا۔ ٹیکس جمع کرنا، امن برقرار رکھنا، مجرموں کو سزائیں دینا، ایسے کام ہیں جن سے عوامی مقبولیت میں کمی آتی تھی۔ چنانچہ عوام کی طرف سے بھی فلسطینی اتھارٹی کے ساتھ تعاون نہیں تھا۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

بدقسمتی سے جس طرح عام طور پر مسلمانوں میں آمریت کے جراثیم ہیں، وہی حال یاسر عرفات اور اس کی پوری ٹیم کا ہوا۔ اتھارٹی نے اپنے سیاسی مخالفین کو جیل میں ڈال دیا۔ کرپشن بہت بڑھ گئی۔ علاقہ ایک پولیس اسٹیٹ کا منظر پیش کرنے لگا۔ کاروبار خراب ہو گئے۔ چنانچہ اس اتھارٹی کی بین الاقوامی اور اندرونی پوزیشن بہت خراب ہو گئی۔ اور اسرائیل کو یہ موقع مل گیا کہ وہ اس صورت حال کو استعمال کرے۔

تاہم اس معاہدے کے کچھ فوائد بھی ہوئے۔ اگر فلسطینی قوم متحد رہتی اور فلسطینی اتھارٹی کی فروگزاشتوں پر تنقید کرتے ہوئے خالصتاً عدم تشدد سے کام لیتی تو بعد کی آزمایش اور مصیبتیں کم ہو سکتی تھیں۔ مثلاً اس معاہدے کے بعد فلسطینی ریاست کو دنیا کے دو تہائی ممالک نے تسلیم کر لیا۔ نوے فیصد فلسطینی عملاً اسرائیل کی قبضے سے آزاد ہو گئے اور اب ہر فلسطینی کے پاس اسرائیلی پاسپورٹ کے بجائے فلسطین کا پاسپورٹ ہے۔ تاہم حماس نے اس درمیان میں خودکش حملوں کا سلسلہ جاری

رکھا۔اس صورت حال سے اسرائیل کی انتہا پسند لیکوڈ پارٹی نے فائدہ اٹھایا اور ۱۹۹۶ میں وہ انتخابات جیت گئی جس سے فلسطینیوں کے راستے میں مزید مشکلات پیدا ہوگئیں۔

اسرائیل اور فلسطین کے حکومتی مذاکرات

جولائی ۲۰۰۰ء میں کیمپ ڈیوڈ میں صدر کلنٹن کے ذریعے سے یاسر عرفات اور اسرائیل کے اعتدال پسند لیبر پارٹی کے وزیر اعظم ایہود بارک کے درمیان مذاکرات ہوئے۔ یہ مذاکرات کئی دن جاری رہے۔کلنٹن نے ان مذاکرات کی کامیابی کی سر توڑ کوشش کی، مگر یہ کامیاب نہ ہوسکے۔ ناکامی کی اصل وجوہات دو تھیں ایک یہ کہ یروشلم کے معاملے میں یاسر عرفات کا رویہ غیر لچک دار تھا۔ اور دوسرا یہ کہ ایہود بارک نے ان چھ لاکھ (جن کی تعداد اب بہت بڑھ چکی ہے) فلسطینی مہاجرین کو واپس لینے سے انکار کر دیا جو ۱۹۴۸ء کی عرب اسرائیل جنگ میں بے گھر ہوگئے تھے۔ بالآخر کلنٹن نے ایک فارمولا پیش کیا۔جس کے مطابق مسجد اقصیٰ اور مشرقی یروشلم فلسطین کے پاس ہوتا اور دیوار گریہ سمیت مغربی یروشلم اسرائیل کے پاس ہوتا۔ واضح رہے کہ مشرقی یروشلم میں دو لاکھ فلسطینی بستے ہیں اور مغربی یروشلم میں ساڑھے چار لاکھ یہودی بستے ہیں۔ مہاجرین کے متعلق کلنٹن کی تجویز تھی کہ انھیں فلسطینی ریاست میں آباد کیا جائے اور ان کی آبادکاری کے سارے اخراجات امریکہ برداشت کرے گا۔ یہ فارمولا ایہود بارک نے منظور کر لیا اور یاسر عرفات نے اسے مسترد کر دیا چنانچہ مذاکرات ناکام ہوگئے۔

راقم کے نزدیک یہ فلسطینیوں اور یاسر عرفات کی سب سے فاش غلطی تھی۔انھیں جو کچھ مل رہا تھا، اس سے زیادہ ملنا مستقبل قریب میں ناممکن تھا۔

اس حل کے بارے میں تفصیلی بحث ہم بعد میں کریں گے جب بیت المقدس، قبۃ الصخرا، دیوار گریہ اور مسجد اقصیٰ جیسی اصلاحات کی وضاحت کی جائے گی۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

۲۸ دسمبر کے بعد دوسرا انتفاضہ

مذاکرات کی ناکامی سے معتدل وزیر اعظم ایہود بارک کی اپنے ملک میں مقبولیت کم ہوگئی، اس لیے کہ وہ اس وعدے پر برسر اقتدار آیا تھا کہ وہ فلسطینیوں کے ساتھ معاہدہ کرے گا۔اس کی اس کم ہوتی ہوئی مقبولیت سے اس کے حریف لیکوڈ پارٹی کے لیڈر رایرل شیرون نے فائدہ اٹھانے کا سوچا۔ چنانچہ اس نے یہ اعلان کیا کہ وہ ۲۸ دسمبر ۲۰۰۰ کو قبۃ الصخرا کا باہر سے دورہ کرے گا۔ واضح رہے کہ اس کا یہ دورہ خدانخواستہ مسجد اقصیٰ کا نہیں تھا۔ مسجد اقصیٰ کی نگرانی آج بھی اردن کی وزارت اوقاف کے پاس ہے۔قبۃ الصخرا ایک چٹان کے اوپر گنبد کا نام ہے (یہی وہ گنبد ہے جس کی تصویر کو لوگ عام طور پر غلطی سے مسجد اقصیٰ

سمجھتے ہیں)۔جس کی ایک تاریخی اہمیت ضرور ہے، مگراس کی کوئی دینی اہمیت نہیں۔اس طرح ایریل شیرون دو مقاصد حاصل کرنا چاہتا تھا۔ایک یہ کہ وہ اسرائیلی عوام کو یہ دکھانا چاہتا تھا کہ وہ فلسطینیوں کے خلاف، ایہود بارک کے برعکس، ایک سخت موقف اختیار کرنے والا فرد ہے۔ دوسرا وہ اس طریقے سے فلسطینیوں کو اشتعال دلانا چاہتا تھا تاکہ ہنگامے ہوں۔ حالات ایہود بارک کے قابو میں نہ رہیں اور اسے نئے انتخابات کرانے پڑیں۔

سوال یہ ہے کہ اس وقت کون سی حکمت عملی فلسطینی عوام کے حق میں بہتر تھی۔کیا انھیں اشتعال میں آنا چاہیے تھا؟ یا انھیں شیرون کی چال ناکام بنانی چاہیے تھی؟ ظاہر ہے کہ ان کے حق میں صحیح حکمت عملی یہ تھی کہ وہ اس دورے کی زبانی کلامی خوب مذمت کرتے، مگر کوئی متشددانہ اقدام نہ کرتے تاکہ شیرون کی سازش ناکام ہو جاتی، مگر فلسطینی شیرون کی چال میں آگئے۔اگلے دن سے ایک نیا انتفاضہ شروع ہو گیا۔ پر تشدد ہنگامے شروع ہو گئے۔اگلے چند مہینوں میں ان ہنگاموں میں سیکڑوں فلسطینی اور بیسیوں یہودی کام آئے۔ بالآخر ایہود بارک کو نئے انتخابات کا اعلان کرنا پڑا جس میں شیرون نے باسٹھ(۶۲) فی صد ووٹ لے کر ریکارڈ کامیابی حاصل کی۔

شیرون کی کامیابی کے بعد اسرائیل کی طرف سے ظلم و بربریت کا ایک نیا دور شروع ہو گیا۔فلسطینیوں کی طرف سے ہر تشدد کا اسرائیل کی طرف سے دس گنا ردعمل کے ساتھ جواب دیا گیا۔کئی کئی دن تک یاسر عرفات کے دفتر کا محاصرہ کیا گیا۔ان کے دفتر کی بجلی اور پانی کو بند کر دیا گیا۔حتیٰ کہ ان کے لیے خوراک کی فراہمی بھی بند کر دی گئی۔ بلڈوزروں کے ذریعے سے مشتبہ افراد کے گھر مسمار کر دیے گئے۔

اسی دوران میں فلسطینیوں کی طرف سے خود کش حملے شروع ہو گئے۔یوں تو اس سے بہت پہلے سے اکا دکا خود کش حملے جاری تھے، مگر اب باقاعدہ ایک ترتیب کے ساتھ یہ کیے گئے۔کچھ خود کش حملے تو براہ راست فوجی تنصیبات پر کیے گئے، لیکن کئی حملے سول جگہوں مثلاً ریستوران، بس اور عام علاقوں میں کیے گئے۔اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ اسرائیل کے اندر خوف کی ایک فضا بن گئی۔اور اس کا نقصان یہ ہوا کہ باقی دنیا نے اسرائیل کے خلاف ان خود کش حملوں کی مذمت کر دی۔

یہ خود کش حملے حکمت عملی اور اصول، دونوں کے خلاف تھے۔خود کش حملوں کے لیے وہی انسان اپنے آپ کو پیش کرتا ہے جو انتہائی پرعزم اور بہادر ہو۔ایسے ہی لوگ کسی تحریک کا اصل سرمایہ ہوتے ہیں۔ایسے لوگ جب اپنی جان، جان آفرین کے سپرد کر دیتے ہیں تو یہ تحریک کے لیے ایک بڑا نقصان ہوتا ہے۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب ایسے حملوں کی رفتار کو برقرار رکھنا ممکن نہیں ہوتا۔ اصولی اعتبار سے بھی یہ حملے غلط ہیں۔اگر ایسا کوئی حملہ کسی باقاعدہ ریاست کی طرف سے کسی برسر جنگ ریاست کی فوج کے خلاف ہو تو اس کے جواز کا سوچا جا سکتا ہے، لیکن اگر یہ غیر فوجی تنصیبات کے خلاف ہو اور اس میں عام لوگ ہلاک ہوں تو انھیں کسی صورت میں جائز قرار نہیں دیا جا سکتا۔

ایسے حملوں کا توڑ کرنے کے لیے حریف طاقتیں بھی اپنی حکمت عملی بنا لیتی ہیں۔اسرائیل نے اس سے نمٹنے کے لیے یہ

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

حکمت عملی اپنائی کہ خودکش حملہ آوروں کے گھر مسمار کر دیے اور ان کے رشتہ داروں کو جلاوطن کر دیا۔ظاہر ہے کہ اسرائیل کا یہ طرزعمل بہت ظالمانہ اور غلط تھا۔مگر بہرحال اس سے یہ خودکش حملے آہستہ آہستہ تھم گئے۔

انتفاضہ کا یہ دوسرا دور کسی مثبت نتیجہ کے بغیر ختم ہوگیا۔اس سے فلسطینیوں کے مال و جان کا بڑا نقصان ہوا۔اور یہ بات صاف واضح ہوگئی کہ اس سے پہلے اسرائیل فلسطینی ریاست کے لیے جتنی زمین دینے کے لیے تیار تھا، اب وہ ان سے بھی سخت تر شرائط پر معاملہ کرے گا۔

امریکہ کا نیا روڈ میپ اور محمود عباس کی وزارت عظمٰی

امریکہ نے یہ الزام لگایا کہ امن منصوبے کے راستے میں اصل رکاوٹ یاسر عرفات ہے اور جب تک وہ کسی اور فرد کو وزیراعظم نامزد نہیں کر لیتا، تب تک امریکہ اس مسئلے میں کوئی دلچسپی نہیں لے گا۔ چونکہ ساری دنیا جانتی ہے کہ اگرچہ امریکہ، اسرائیل کا پشتی بان اور حمایتی ہے، لیکن اس کے بغیر یہ مسئلہ حل تو کیا، ایک انچ آگے بھی نہیں سرک سکتا، بلکہ مسلسل مسلمانوں کے لیے مشکل سے مشکل تر ہوتا چلا جاتا ہے، اس لیے یاسر عرفات پر ہر طرف سے یہ دباؤ پڑا کہ ایک بااختیار وزیراعظم مقرر کرے۔ چنانچہ اس نے اپنے ایک قریبی ساتھی محمود عباس (ابومازن) کو وزیراعظم نامزد کیا۔ یہ نام امریکیوں کو بھی قبول تھا۔ اس لیے انھوں نے اس کا خیر مقدم کیا اور صدر بش نے مشرق وسطٰی کے لیے اپنا روڈ میپ دے دیا۔ اس روڈ میپ کے مطابق اگلے دو برس میں ایک آزاد فلسطینی ریاست کا وجود عمل میں آنا ہے اور اس مقصد کے لیے ایک ایسا پروگرام ترتیب دیا گیا ہے جس میں ہر اہم مرحلے پر اسرائیل اور فلسطین کو ایک ایک قدم لینا ہے۔ اس روڈ میپ میں تین اہم ترین مسائل یعنی فلسطینی مملکت کے حدود، یروشلم کا مستقبل اور فلسطینی مہاجرین کی وطن واپسی کا کوئی حل نہیں دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ اصل حل کا انحصار تو انھی مسائل پر ہے۔ یہ روڈ میپ یاسر عرفات کے ساتھ ساتھ شیرون کو بھی منظور نہیں تھا، لیکن امریکہ کے دباؤ پر دونوں فریقوں کو یہ منظور کرنا پڑا۔ اس روڈ میپ کے بعد دونوں طرف سے تشدد کا سلسلہ کسی حد تک کم ہو گیا۔ اسرائیلی فوج کچھ شہروں سے نکل گئی۔ تاہم عمل درآمد کی رفتار بہت تسلی بخش نہیں ہے۔ اسرائیل کی طرف سے غرب اردن اور غزہ کو اسرائیل سے علیحدہ کرنے والی بہت بڑی دیوار کے منصوبے نے مزید مشکلات پیدا کر دی ہیں۔ اسرائیل کا کہنا ہے کہ یہ دیوار اس لیے تعمیر کی جا رہی ہے کہ تخریب کاروں پر نظر رکھی جا سکے۔ فلسطین کا کہنا ہے کہ یہ دیوار جان بوجھ کر اس طرح تعمیر کی جا رہی ہے کہ غرب اردن اور غزہ کا زیادہ سے زیادہ علاقہ اسرائیل اپنے ساتھ شامل کر سکے اور بالآخر یہی دیوار سرحد بنے۔

فی الوقت یہ کہنا آسان نہیں کہ یہ روڈ میپ کامیاب ہو سکے گا یا نہیں۔ تاہم ایک محدود پرامیدی اس بنا پر کی جا سکتی ہے کہ شاید اب امریکہ واقعتاً اس مسئلے کو حل کرنا چاہتا ہے، کیونکہ اس کے منفی اثرات اس کے لیے بڑی مشکلات کا باعث بن رہے

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ہیں۔

اسرائیل کی تعمیر میں امریکہ کا کردار

اسرائیل کی تخلیق اصلاً برطانیہ کی مرہون منت ہے۔اور اسرائیل کی تعمیر میں یہودیوں کی ان تھک جدوجہد کے ساتھ ساتھ امریکی یہودیوں کا پیسہ اور حکومت امریکہ کی مسلسل مادی واخلاقی امداد بھی شامل ہے۔

فی الوقت یہودیوں کی سب سے زیادہ تعداد امریکہ میں بستی ہے جن کی تعداد باون (۵۲) لاکھ ہے۔اس کے بعد اسرائیل کا نمبر آتا ہے جہاں اڑتیس (۳۸) لاکھ یہودی بستے ہیں۔امریکی یہودی انتہائی بااثر اور مال دار ہیں۔ ہر اہم ادارے میں ان کے بہت مضبوط لوگ ہیں۔دونوں سیاسی پارٹیوں میں اہم ترین عہدوں پر وہ فائز ہیں۔اگرچہ ان یہودیوں کے اندر بہت سے معاملات پر بے شمار اختلافات پائے جاتے ہیں، تاہم اسرائیل کی سلامتی، بقا، تحفظ اور تعمیر کے معاملے میں وہ سب پوری طرح متحد ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کسی امریکی حکومت کے لیے اسرائیل کی مخالفت کرنا ممکن نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسرائیل کے قیام کے پہلے دن سے ہی اسے امریکی امداد کی فراہمی شروع ہوگئی۔ یہ امداد دو شکلوں میں ہے۔ایک شکل امریکی یہودیوں کی طرف سے اسرائیل کو براہ راست رقم کی فراہمی اور دوسری شکل امریکی حکومت کی طرف سے ریاستی سطح پر امداد۔امریکہ کی طرف سے سب سے زیادہ امداد اسرائیل کو ملتی ہے، بلکہ یہ کسی بھی ملک کی طرف سے کسی بھی ملک کو ملنے والی سب سے زیادہ امداد ہے۔صرف یہی نہیں ، بلکہ اگر اسرائیل کو کوئی مسئلہ پیش آجائے مثلاً کسی جنگ میں اس کے اخراجات ہو جائیں تو امریکہ فوراً اس نقصان کو پورا کر دیتا ہے۔اسرائیل نے جان بوجھ کر اپنے ملک میں ایسی طرز معاشرت رکھی ہوئی ہے کہ اگر امریکہ سے کوئی سیاح اسرائیل چلا جائے تو اسے کسی غیریت کا احساس نہ ہو۔اس معاملے میں اسرائیل نے یہودی نظام اخلاقیات کی تمام پابندیوں کی دھجیاں اڑائی ہوئی ہیں۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے، تاہم ہمیں اس کا شعور ہونا چاہیے کہ مستقبل قریب میں بھی اسرائیل کے لیے امریکی امداد یونہی جاری رہے گی۔

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.org

چند اہم نکات

اب تک کی بحث سے چند اہم نکات ہمارے سامنے آتے ہیں:

اسرائیل کی تخلیق برطانیہ نے کی اور اس کی تعمیر میں امریکہ نے ایک بڑا کردار ادا کیا۔

مسلمانوں کی خودغرضی، کوتاہ اندیشی، غلط فیصلوں، عدم جمہوریت اور حقائق کی بنیاد پر حکمت عملی نہ بنانے کی روش نے اسرائیل کے قیام کو آسان اور اس کی تعمیر کو آسان تر بنا دیا ہے۔ مثلاً اگر سلطنت عثمانیہ میں جمہوریت اور صوبائی خودمختاری ہوتی،

اگر وہ ہوا کا رخ بھانپ کر عرب مقبوضات کو آزادی دے دیتی اور اگر ترکی کی حکومت پہلی جنگ عظیم میں کود نہ پڑتی تو اسرائیل کا قیام ناممکن حد تک مشکل ہوتا۔

عربوں کی نااتفاقی، عاقبت نااندیشی اور اپنے ذاتی مفادات کے لیے اجتماعی مقاصد کو قربان کرنے کی روش نے بھی اسرائیل کی تعمیر اور تسلسل میں پورا کردار ادا کیا۔ مثلاً پہلی جنگ عظیم میں عربوں نے برطانیہ کی حمایت کی۔ قیام اسرائیل کے وقت فلسطینی ریاست نہ بننے کے معاملے میں اسرائیل اور اردن کے شاہ عبداللہ نے باقاعدہ خفیہ معاہدہ کیا۔ پچھلے پچاس سال میں تمام عرب مسلسل آپس میں لڑتے رہے۔ اردن اور مصر نے فلسطینی ریاست پر قبضہ کیا اور اپنے زیر قبضہ علاقے میں فلسطینی ریاست نہ بننے دی۔ سادات نے اسرائیل سے گفت و شنید میں صحرائے سینا تو واپس لے لیا، مگر غزہ کا علاقہ بدستور اس کے قبضے میں رہنے دیا، حالانکہ وہ علاقہ اسرائیل نے مصر سے ہی چھینا تھا۔

فلسطین کے معاملے میں عربوں نے ہمیشہ حکمت عملی اور زمینی حقائق کے خلاف قدم اٹھایا۔ ۱۹۱۷ء میں اعلان بالفور اور سائی کس پیکاٹ معاہدہ منظر عام پر آ چکا تھا۔ یہی وہ وقت تھا جب عربوں کو، انگریزوں کے ساتھ میز پر بیٹھ کر ایک قابل عمل معاہدہ کر لینا چاہیے تھا۔ اس وقت عربوں اور انگریزوں کی طاقت میں ایک نسبت ہزار کا فرق تھا۔ اور جب یہ صورت ہو تو قابل عمل پرامن معاہدہ ہی کمزور قوم کے مفاد میں ہوتا ہے۔ پھر ۱۹۴۸ء میں اگر عرب اقوام متحدہ کی قرارداد منظور کر لیتے تو آج کی نسبت ایک تہائی اسرائیل وجود میں آتا۔ اس کے بعد بھی اگر عرب اپنے زیر قبضہ علاقہ میں فلسطینی ریاست بنا دیتے تو اسرائیل سے گفت و شنید آسان ہو جاتی اور یروشلم بمع بیت المقدس مسلمانوں کے پاس رہتا۔ اگر ناصر بڑکیں نہ ہانکتا اور مسلسل دھمکیاں دینے کے بجائے اپنی مملکت کے دفاع کی طرف توجہ دیتا تو ۱۹۶۷ء کا سانحہ پیش نہ آتا۔ اسی طرح فلسطینیوں کی طرف سے ہر متشددانہ کارروائی نے ان کی آزادی کو مزید دور اور ان کے ممکنہ علاقے کو مزید محدود کر دیا ہے۔

آج اسرائیل کم آبادی والی ایک بڑی طاقت بن چکا ہے جس کے پاس سیکڑوں ایٹم بم بھی ہیں۔ دنیا کی تمام بڑی طاقتوں کے ساتھ اس کے تعلقات ہیں۔ ٹیکنالوجی اور فی کس آمدنی کے لحاظ سے وہ دنیا کے سرفہرست ملکوں میں شامل ہو گیا ہے۔ اردگرد کے تمام عرب ممالک کی مجموعی معاشی، فوجی اور اسلحی ذخائر سے اس کے ذخائر کہیں زیادہ ہیں۔ کئی مسلمان ممالک بشمول اردن، مصر، تنظیم آزادی فلسطین، قطر اور ترکی نے اسے تسلیم کیا ہوا ہے اور ان کے ساتھ اس کے سفارتی تعلقات قائم ہیں۔

چنانچہ اب ہمیں اس امر پر غور و فکر کرنا ہے کہ موجودہ حالات میں فلسطینیوں اور مسلمانوں کے لیے بہتر اور قابل عمل حل کیا ہے۔

اس سوال کے جواب سے پہلے ہمیں بیت المقدس اور یروشلم کی صورت حال کو سمجھنا ہوگا۔ یروشلم اس شہر کا نام ہے جہاں

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

یہ مقدس احاطہ ''بیت المقدس'' کے نام سے موسوم ہے جسے ہیکل سلیمانی بھی کہا جاتا ہے۔ یہ ایک احاطے کا نام ہے جس کی لمبائی اندازاً چار سو ساٹھ (۴۶۰) فٹ ہے اور چوڑائی اندازاً تین سو تیس (۳۳۰) فٹ ہے۔ یہ دراصل وہ جگہ ہے جہاں حضرت سلیمان علیہ السلام نے ایک بڑا عمارتی کمپلکس بنایا تھا جو ان کا سیکرٹریٹ تھا۔ اس کی تعمیر کے ساڑھے تین سو برس بعد بابل کے بادشاہ نبوکدنظر نے اس کو تباہ کر دیا۔ اس کے تقریباً ستر سال بعد ان کو دوبارہ یہ جگہ تعمیر کرنے کی اجازت ملی، اس لیے کہ اس وقت وہاں فارس کے بادشاہ کا قبضہ ہو چکا تھا۔ اس کے بعد یہ جگہ کئی دفعہ مختلف حملہ آوروں کی طرف سے تباہی کا نشانہ بنتی اور بار بار تعمیر ہوتی رہی۔ حتیٰ کہ پہلی بڑی تباہی کے ساڑھے چھ سو برس بعد یعنی ۷۰ء میں رومی حکومت نے اس کو بالکل تباہ کر دیا۔ یہود کا قتل عام کیا اور زندہ بچ جانے والے یہودیوں کو جلاوطن کر دیا۔ اس تباہی میں ہیکل کی صرف مغربی دیوار کا ایک حصہ محفوظ رہ گیا۔ یہی وہ دیوار ہے جسے اب دیوار گریہ (Wailing Wall) کہا جاتا ہے یعنی وہ جگہ جہاں یہودی آ کر اپنی عظمت رفتہ کی یاد میں روتے ہیں اور عبادات کرتے ہیں یہ گویا ان کے لیے مقدس ترین جگہ اور ان کا قبلہ ہے۔

اس دوسری تباہی کے پانچ سو ستر سال بعد یعنی ۶۳۸ء میں مسلمانوں نے حضرت عمر کے وقت میں یروشلم فتح کیا۔ حضرت عمر نے اس پوری جگہ کو، جہاں کوڑا کرکٹ پڑا ہوا تھا، صاف کیا اور اس کے جنوب میں ایک جگہ نماز پڑھنے کے لیے مخصوص کر دی۔ یہی جگہ اب مسجد اقصیٰ ہے۔ موجودہ مسجد اقصیٰ کی لمبائی تقریباً دو سو بیس (۲۲۰) فٹ اور چوڑائی اندازاً ایک سو تین (۱۰۳) فٹ ہے۔ راقم کا تجزیہ یہ ہے کہ حضرت سلیمان کے وقت ان کی اصل مسجد اسی جگہ واقع تھی۔ اسی لیے حضرت عمر نے خاص اسی جگہ کو مسجد ٹھہرایا۔ ورنہ وہ چاہتے تو اس تمام احاطے کو مسجد قرار دے سکتے تھے۔ حضرت عمر نے باقی احاطے کو عیسائیوں یا یہودیوں کے لیے ممنوع قرار نہیں دیا۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

درمیان میں اٹھاسی (۸۸) سال کے ایک وقفے کے سوا پچھلے چودہ سو سال سے یہ پوری جگہ مسلمانوں کے قبضے میں رہی۔ ۱۹۶۷ء میں اسرائیل نے اس پر قبضہ کر لیا۔ تاہم حکومت اسرائیل نے مسجد پر قبضہ نہیں کیا، بلکہ اس جگہ کی چابیاں حکومت اردن کے حوالے کر دیں۔ اس وقت سے لے کر اب تک مسجد کا نظم و نسق یروشلم کے مسلم وقف کے پاس ہے۔

اس پورے احاطے کا ایک انتہائی اہم حصہ قبۃ الصخرا ہے۔ اہم اس حوالے سے کہ اس کے متعلق مسلمانوں کی معلومات بہت کم ہیں۔ یہ دراصل ایک چٹان ہے جس کی اونچائی تقریباً پانچ فٹ ہے۔ اس چٹان کے اردگرد لکڑی کا ایک کٹہرا ہے۔ اس کے اوپر ایک بڑا سبز گنبد ہے۔ یہی وہ گنبد ہے جو ہر تصویر میں نظر آتا ہے اور جسے عام مسلمان لاعلمی کے باعث مسجد اقصیٰ کا گنبد سمجھتے ہیں۔ یہ بالکل ایسی ہی ایک جگہ ہے جیسے ہمارے ہاں مزار اور گنبد والا مقبرہ ہوتا ہے۔ صرف اتنا فرق ہے کہ یہاں مزار کے بجائے چٹان ہے۔ گویا یہ کوئی مسجد نہیں، بلکہ محض ایک یادگار ہے۔

اس کی تعمیر کی داستان بھی دلچسپ ہے۔ صحابۂ کرام کے زمانے میں اس چٹان اور اس سے ملحق جگہ کو کوئی اہمیت نہیں دی

گئی۔ یہاں نماز بھی نہیں پڑھی جاتی تھی۔ اسے مسجد کا حصہ بھی نہیں بنایا گیا۔ یعنی یہ کوئی تقدس کی حامل جگہ نہیں تھی۔ بعد میں بنوامیہ کے زمانے میں ولید بن عبدالملک نے اس پر گنبد تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ دراصل اس وقت مکہ معظّمہ میں ولید کے مخالف عبداللہ بن زبیر کی حکومت تھی اور جو لوگ بھی باہر سے حج کے لیے جاتے تھے، ان سے ابن زبیر اپنی حکومت کی بیعت لیتا تھا۔ چنانچہ ولید نے اپنی مملکت کے لوگوں کو حج پر جانے سے روک دیا اور یہاں اس چٹان کو ایک مقدس مقام قرار دیا تا کہ حج کے بجائے لوگ یہاں آئیں اور اس جگہ کا طواف کریں۔ ظاہر ہے کہ اس اقدام کا دینی تعلیمات سے کوئی تعلق نہیں تھا، بلکہ یہ ایک سیاسی اقدام تھا۔

جب بھی کسی جگہ کو باقاعدہ ایک مقصد کے تحت تقدس دیا جاتا ہے تو یہ ضروری ہوتا ہے کہ اس کی عظمت سے متعلق داستانیں لوگوں میں پھیلائی جائیں اور اس کے متعلق قصے کہانیاں مشہور کی جائیں۔ چنانچہ قبۃ الصخرا کے متعلق بھی یہی ہوا ہے اور اس ضمن میں بہت سی احادیث بھی گھڑی گئیں۔ اس طرح کی من گھڑت روایات کو احادیث کی چھ اہم ترین کتابوں میں سے کسی نے اپنے ہاں جگہ نہیں دی۔ تمام اہل علم ان روایات کو انتہائی ضعیف قرار دیتے ہیں اور ابن القیم اور البانی جیسے علماے حدیث ان کو جھوٹا اور من گھڑت کہتے ہیں۔

چونکہ خانۂ کعبہ، مسجد اقصیٰ سے جنوب کی طرف ہے، اس لیے جب مسلمان مسجد اقصیٰ میں نماز پڑھتے ہیں تو ان کی پشت قبۃ الصخرا کی طرف ہوتی ہے۔ یہ قبہ، مسجد اقصیٰ کی عمارت سے تقریباً ایک سو پچھتر (۱۷۵) فٹ شمال میں ہے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں ۲۸ ستمبر ۲۰۰۰ کا اس وقت کے اسرائیل کے حزب اختلاف کے رہنما ایریل شیرون نے باہر سے دورہ کیا تھا جس کے نتیجہ میں دوسرا انتفاضہ اور فسادات پھوٹ پڑے تھے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

یہاں تین اہم سوالات پر غور و فکر ضروری ہے۔ ایک سوال یہ ہے کہ کیا سارا احاطہ بیت المقدس یعنی ۴۶۰x۳۳۰ فٹ کی جگہ مسلمانوں کا قدرتی، اخلاقی اور مذہبی حق ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ کیونکہ حضرت عمر نے اس کا ایک ٹکڑا مسجد اقصیٰ کی شکل میں مسجد کے لیے مختص کر دیا تھا۔ باقی احاطے میں کسی بھی مذہب سے تعلق رکھنے والے کسی بھی فرد کے آگے جانے پر کوئی پابندی نہیں لگائی گئی۔ چنانچہ آج بھی اگر کوئی ایسا معاہدہ ہو جائے جس میں تمام مذاہب کے تقدس و احترام کو مدنظر رکھا جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوا کہ پچھلے ساٹھ برس سے معرکۂ فلسطین سے متعلق تصویر میں مسجد اقصیٰ کی تصویر تو کہیں نظر نہیں آتی اور ہمیشہ قبۃ الصخرا کی تصویر ہی نمایاں ترین حصے کے طور پر سامنے لائی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فلسطینیوں کی لیڈر شپ شروع سے ہی قوم پرست لوگوں کے ہاتھ میں رہی ہے۔ اس لیے انھوں نے دانستہ طور پر ایک مذہبی عمارت کو اپنا شعار بنانے سے گریز کیا۔ بعد میں جب اسلامی ذہن رکھنے والے لوگوں کو بھی آزادی فلسطین کی تحریک میں اہمیت حاصل ہوگئی تو چونکہ ان پر بھی جذبات کا غلبہ تھا۔ اس لیے انھوں نے یہ موقف اختیار کر لیا کہ اس پورے احاطے پر مسلمانوں کے علاوہ کسی کا

حق نہیں۔ چنانچہ انھوں نے بھی مسجد اقصیٰ کو نمایاں کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ کیا دینی اعتبار سے یہ ممکن ہے کہ ہم اس پوری زمین کے کسی حصے پر اسرائیل نامی ایک ریاست کو تسلیم کر کے قانونی طور پر ان کا یہ حق مان لیں کہ وہ بھی یہاں رہ سکتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ اسرائیل کا وجود بے انصافی، ظلم اور جبر کے نتیجے میں وجود میں آیا ہے اور اس لحاظ سے اس کی اخلاقی حیثیت کچھ بھی نہیں۔ تاہم اس دنیا میں بے شمار ممالک ظلم اور جبر ہی کے نتیجے میں وجود میں آئے ہیں اور ہم سیاسی حقیقت کے طور پر ان کا وجود تسلیم کرتے ہیں اور ان سے معاملات کرتے ہیں، مثلاً ہم امریکہ پر ریڈ انڈین کے بجائے موجودہ سفید فام لوگوں کا وجود تسلیم کرتے ہیں۔ اسی طرح ہم سنکیانگ پر چین کی عمل داری تسلیم کرتے ہیں۔ یہی حال اسرائیل کا ہے۔ دینی اعتبار سے ہمارے لیے کافی ہے کہ مسجد اقصیٰ اور اس تک پہنچنے کے راستے مسلمانوں کے قبضے میں ہوں تا کہ ہم اپنے اس تیسرے مقدس ترین مقام تک آسانی اور خود اعتمادی سے پہنچ سکیں۔ باقی رہا اسرائیل کو تسلیم کرنے کا سوال، تو یہ دینی نہیں، بلکہ سیاسی مسئلہ ہے۔ مسلمان ممالک اس کے مثبت اور منفی اثرات کا معروضی جائزہ لے کر اس کا کوئی بھی مناسب فیصلہ کر سکتے ہیں۔ ہمارا کام تو یہ دیکھنا ہے کہ دستیاب حالات میں مسلمانوں کے لیے بہترین حکمت عملی کونسی ہے جس کے ذریعے سے مسلمان امن و وقار سے رہ سکیں اور ترقی کر سکیں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

حل

مسئلۂ فلسطین کے حل میں اس وقت تین معاملات سب سے زیادہ اہم ہیں۔ ایک یہ کہ غرب اردن اور غزہ کی پٹی کا کتنا حصہ فلسطین کو دیا جائے۔ دوسرا یہ کہ یروشلم کے مقدس مقامات کو کیسے تقسیم کیا جائے اور تیسرا یہ کہ جو فلسطینی ۱۹۴۸ء میں مہاجر ہو گئے تھے، ان کی دوبارہ آباد کاری کہاں اور کیسے کی جائے۔ جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے، انصاف کا تقاضا تو یہ ہے کہ یہ دونوں علاقے سو فی صد فلسطینی ریاست کی عمل داری میں دیے جائیں۔ تاہم مسئلہ یہ ہے کہ ان دونوں علاقوں خصوصاً غرب اردن میں اسرائیل نے بہت سی یہودی آبادیاں تعمیر کر لی ہیں۔ چنانچہ اگر ان میں سے کچھ آبادیوں پر فلسطین کی طرف سے لچک دکھائی جائے تو مناسب ہے۔ ویسے بھی فلسطینی ریاست کا اصل مسئلہ زمین نہیں ہے، اس لیے کہ اردگرد کے عرب ممالک کے پاس بے تحاشا علاقے ہیں اور اگر وہ چاہیں تو اپنے کچھ علاقے (مثلاً صحرائے سینا) فلسطین کے حوالے کر کے اسے اسرائیل سے کئی گنا بڑا ملک بنا سکتے ہیں۔

دوسرا مسئلہ یروشلم کے مقدس مقامات کا ہے۔ جیسا کہ قارئین کے مطالعے میں آ چکا، اس مسئلے کا قابل عمل حل موجود ہے۔ وہ یہ کہ مسجد اقصیٰ اور یروشلم کا مسلم اکثریتی علاقہ، فلسطین کے حصے میں آئے اور دیوار گریہ، مغربی یہودی اکثریتی علاقے سمیت اسرائیل کو دی جائے۔ جہاں تک قبۃ الصخرا کا تعلق ہے، اسے فلسطین اور اسرائیل کی مشترکہ عمل داری میں دیا جا سکتا ہے۔ یہ

بھی عین ممکن ہے کہ اسرائیل، اسے مکمل طور پر فلسطین کو دینے پر رضا مند ہو جائے۔ اس لیے کہ وہاں عام طور پر یہودی زائرین نہیں جاتے۔

تیسرا مسئلہ ان لاکھوں فلسطینیوں کا ہے جو ۱۹۴۸ء میں مہاجر ہو گئے تھے۔ انصاف کا تقاضا تو یہ ہے کہ ان سب کو واپس اپنے اپنے گھروں میں آنے کی اجازت دی جائے۔ ان کے سابقہ گھر موجودہ اسرائیل میں واقع ہیں۔ تاہم اسرائیل کبھی یہ بات نہیں مانے گا، اس لیے کہ اس طرح اسرائیل میں یہودی اقلیت میں تبدیل ہو جائیں گے۔ یہ تاریخ کا ایک سفاک جبر ہے کہ مہاجرین کے لیے عموماً واپس اپنے علاقے میں جانا ممکن نہیں ہوتا۔ مثلاً افغانستان سے روسی افواج کو نکلے ہوئے پندرہ برس ہو چکے، مگر افغان مہاجرین ابھی تک پاکستان ہی میں ہیں۔ بنگلہ دیش میں پچھلے تیس برس سے لاکھوں بہاری مہاجر کیمپوں میں زندگی بسر کر رہے ہیں، مگر پاکستان ان کو قبول کرنے سے انکاری ہے۔ یہی صورت فلسطینی مہاجرین کی ہے۔ ان کی آبادکاری کی سب سے قابل عمل صورت یہ ہے کہ ان کو فلسطینی ریاست میں آباد کیا جائے اور اس کی ذمہ داری اقوام متحدہ اٹھائے۔

امت مسلمہ کی ترقی کے لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ فلسطین میں امن قائم ہو جائے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

محمد رفیع مفتی

امام مالک بن انس

آپ کا نام مالک ہے، کنیت ابوعبداللہ، لقب امام دارالہجرہ ہے۔ سلسلۂ نسب مالک بن انس بن مالک بن ابی عامر ہے۔ امام مالک ۹۳ ہجری میں پیدا ہوئے۔ مدینہ میں آپ عبداللہ بن مسعود والے گھر میں رہا کرتے تھے۔

امام مالک خالص عرب تھے۔ ان کا خاندان جاہلیت اور اسلام، دونوں میں معزز تھا۔ بزرگوں کا وطن یمن تھا۔ اسلام کے بعد ان کے خاندان والوں نے مدینہ میں سکونت اختیار کر لی۔ ان کے جد امجد ابوعامر وہ شخصیت ہیں جنھوں نے اسلام قبول کیا تھا۔ وہ صحابی رسول تھے اور انھوں نے جنگ بدر کے سوا باقی سب جنگوں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم راہ شرکت کی تھی۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

تحصیل علم

امام مالک کا گھرانہ علم کا گہوارہ تھا، آپ مدینہ کے رہنے والے تھے، یہ شہر علما و فضلا کا مخزن تھا۔ آپ کی تعلیم کا آغاز بچپن ہی سے ہو گیا۔ اس وقت تعلیم کا نصاب نہایت سادہ ہوا کرتا تھا، یعنی قرآن مجید، حدیث اور فقہ کی تعلیم۔ آپ نے نافع مولیٰ ابن عمر سے اپنے بچپن میں تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی تھی۔ قرآن مجید کی قرأت و سند مدینہ کے امام القراء ابورُدیم نافع بن عبدالرحمٰن سے حاصل کی۔ اسی زمانے میں آپ نے حدیث کی تعلیم بھی حاصل کی۔ حدیث میں آپ کے پہلے شیخ کون ہیں؟ اس حوالے سے دو نام ہمارے سامنے آتے ہیں، ایک نافع مولیٰ ابن عمر کا اور دوسرے آپ کے چچا ابوسہیل کا۔ لیکن ان دونوں میں سے پہلے آپ نے کس سے پڑھا، تاریخ سے یہ معلوم نہیں ہوتا۔ بہر حال اس کے بعد امام مالک نے دیگر کئی اساتذہ سے پڑھا، یہاں تک کہ وہ علم جو مدینہ میں متفرق سینوں میں تھا، آپ کے سینے میں جمع ہو گیا۔ چنانچہ آپ کو امام دارالہجرہ کہا جانے لگا۔

امام مالک طلب علم کے لیے مدینہ سے باہر نہیں گئے، اس کی وجہ یہ ہے کہ مدینہ میں بڑے بڑے اساتذہ موجود تھے اور

مدینہ علم کا مخزن تھا۔

شیوخ واساتذہ

امام مالک کے مشہور شیوخ واساتذہ کی فہرست میں یہ نام آتے ہیں:

ربیعتہ الرائے ، زید بن اسلم ، نافع مولیٰ ابن عمر، ابن شہاب زہری، ابوالزناد، شریک بن عبداللہ، سعید بن ابی سعید المقبری، حمید الطّویل۔

مجلس درس

امام مالک کے شیوخ ہی کی موجودگی میں آپ سے استفادہ کرنے والوں کا پورا ایک حلقہ قائم ہو گیا تھا۔ آپ نے ۱۱۷ھ میں اپنی مجلس درس قائم کی۔ آپ کی مجلس درس ہمیشہ پر تکلف فرش اور بیش قیمت قالینوں سے آراستہ ہوا کرتی تھی۔ وسط مجلس میں شہ نشین تھی جس پر امام مالک حدیث کی املا کرانے کے لیے بیٹھا کرتے تھے۔ حدیث کا درس شروع ہوتا تو انگیٹھی میں عود اور لوبان جلایا جاتا تھا، صفائی کا یہ عالم تھا کہ ایک تنکا بھی بارِ خاطر ہوتا تھا۔ حدیث کی تعلیم کے وقت آپ وضو یا غسل کر کے عمدہ اور قیمتی لباس پہنتے، بالوں میں کنگھی کرتے اور خوشبو لگاتے تھے۔

مجلس میں سب لوگ خاموش اور سرنگوں بیٹھتے تھے۔ حتیٰ کہ ایک موقع پر جب امام ابوحنیفہ بھی آپ کی مجلس میں شریک ہوئے تو وہ بھی بالکل خاموش اور سرنگوں ہو کر بیٹھے، حالانکہ وہ امام مالک سے ۱۳ سال بڑے تھے۔

پوری مجلس پر ایک مقدس سکوت طاری ہوتا تھا۔ جاہ وجلال اور شان وشکوہ سے کاشانۂ امامت پر بارگاہ شاہی کا دھوکا ہوتا تھا۔ آپ کے مکان کے پھاٹک پر سواریوں کا ایک انبوہ دیکھنے والوں پر رعب طاری کر دیتا تھا۔

آپ حدیث کی املا ہمیشہ آہستہ اور سکون کے ساتھ کراتے تھے۔ ایک حدیث ختم ہوتی تو دوسری شروع کر دیتے تھے۔

تلامذہ

آپ سے کسب فیض حاصل کرنے والوں میں چند نمایاں نام یہ ہیں:

امام شافعی، عبداللہ بن مبارک، محمد بن حسین شیبانی، عبداللہ ابن وھب۔

آپ کے بعض رفقا اور معاصرین نے بھی آپ سے کسب فیض حاصل کیا۔ مثلاً:

امام اوزاعی، سفیان بن عیینہ، ابن جریج، امام ثوری، لیث بن سعد، شعبہ بن حجاج۔

تصنیف وتالیف

موطا امام مالک آپ کی جلیل القدر تالیف ہے۔ اس کے علاوہ آپ کی تصنیفات یہ ہیں:

۱۔ الرد علی القدریہ

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

۲۔الرسالۃ الی الرشید

۳۔المدونۃ الکبریٰ۔

موطا کے بارے میں آپ کا اپنا بیان یہ ہے کہ میں نے چالیس برس میں اس کی تدوین کی ہے۔تدوین کے بعد آپ نے مدینہ کے ستر فقہا کے سامنے اسے پیش کیا۔

موطا ہی کا ایک نسخہ وہ بھی ہے جو امام محمد سے روایت کیا گیا ہے۔اس نسخے میں امام محمد نے صرف امام مالک سے حاصل ہونے والی روایات ہی کو نقل نہیں کیا، بلکہ امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف اور بعض دوسرے شیوخ سے ملنے والی روایات کو بھی نقل کیا ہے۔

ان کے علاوہ امام مالک کی کچھ اور تصانیف کا ذکر بھی ہمیں ملتا ہے، مثلاً:

۱۔رسالہ مالک الی ابن مطرف

۲۔رسالہ مالک الی ابن وھب

۳۔کتاب المسائل

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

علما کی شہادت

یحییٰ بن معین جو حدیث و رجال کے ناقد ہیں، کہتے ہیں مالک امیر المومنین فی الحدیث ہیں۔سفیان بن عیینہ کہتے ہیں کہ ہم لوگ مالک کے سامنے کیا چیز ہیں، ہم تو بس ان کے نقش قدم کی پیروی کرتے ہیں۔عبدالرحمٰن بن مہدی کا قول ہے کہ روے زمین پر مالک سے بڑھ کر حدیث نبوی کا کوئی امانت دار نہیں۔امام شافعی فرمایا کرتے تھے کہ جب حدیث آئے تو امام مالک ستارہ ہیں۔امام احمد بن حنبل سے کسی نے دریافت کیا کہ اگر کسی کی (تحقیق شدہ) حدیث آدمی کو زبانی یاد کرنی ہو تو کس کی تحقیق شدہ احادیث یاد کرے؟ انھوں نے جواب دیا مالک بن انس کی۔امام ابن حیان کا قول ہے کہ فقہاے مدینہ میں سے امام مالک وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے نقد رجال پر کام کیا۔

وفات

آخر عمر میں امام اتنے ضعیف و ناتواں ہو گئے تھے کہ مسجد نبوی کی حاضری، جماعت میں شرکت اور شادی وغم کی تقریبات میں آنا جانا بند ہو گیا تھا۔لیکن ضعف و ناتوانی کی حالت میں بھی درس و افتا کی خدمت جاری رہی۔پھر جب آپ مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو تین ہفتہ بیمار رہے۔مرض کی شدت کم نہ ہوئی تو لوگوں کو یقین ہو گیا کہ اب آخری وقت ہے۔جب بالکل موت کا وقت قریب آ گیا تو لوگوں نے دیکھا کہ نبض کی حرکت آہستہ آہستہ کم ہو رہی ہے اور امام کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔آپ کے خاص شاگرد قعنبی نے رونے کا سبب پوچھا تو کہتے ہیں کہ میں کیوں نہ روؤں، اے کاش مجھ کو میرے ہر قیاسی

فتویٰ کے بدلہ میں ایک کوڑا مارا جاتا اور میں فتویٰ نہ دیتا۔ گریہ جاری تھا۔ لب 'لِلّٰہ الامر من قبل و من بعد' کے الفاظ سے متحرک تھے کہ روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ امام صاحب صحیح روایت کے مطابق ۹۳ ہجری میں پیدا ہوئے اور ۱۱ ربیع الاول ۱۷۹ ہجری کو انتقال کر گئے۔ آپ نے چھیاسی برس کی عمر پائی۔ ۱۱۷ ہجری میں مسند درس پر قدم رکھا اور باسٹھ سال تک علم دین کی خدمت میں مصروف رہے۔

مناقب

امام ذہبی کا بیان ہے کہ امام مالک بن انس کے فضائل ومناقب اس قدر زیادہ ہیں کہ وہ کسی اور محدث میں کبھی جمع نہیں ہوئے۔

یہ بات زبان زدعام تھی کہ کیا امام مالک کے ہوتے ہوئے بھی فتویٰ دیا جا سکتا ہے۔ آئمہ کا اجماع ہے کہ آپ حجت ہیں اور صحیح الروایت ہیں۔ آپ کے تدین، عدالت اور صحیح الروایۃ ہونے پر سب متفق ہیں۔ فقہ وفتویٰ اور اصول وقواعد کے صحیح ہونے میں آپ آئمہ میں سب پر فائق ہیں۔

آپ کا شمار عبادت گزاروں میں ہوتا تھا۔ درس وافتا سے جو وقت بچتا، وہ زیادہ تر عبادات اور تلاوت میں صرف ہوتا۔ آپ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا بے حد احترام کرتے تھے۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مبارک نام زبان پر آتا، چہرے کا رنگ متغیر ہو جاتا۔ مدینہ کی گلیوں میں سوار ہو کر نہ چلتے تھے۔ مدینہ سے آپ کو غایت درجہ محبت تھی، بجز سفر حج کے کبھی مدینہ سے باہر نہیں نکلے۔

آپ طبعاً فیاض شخص تھے۔ مہمان نوازی آپ کا خاصا تھی۔ صبر واستقلال کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ موزہ میں بچھو تھا، امام مالک نے بے خبری میں اس کو پہن لیا اور مجلس درس میں آ کر بیٹھ گئے، بچھو نے مسلسل سترہ بار ڈنک مارا، الیکن آداب مجلس کے خیال سے امام نے پہلو تک نہ بدلا۔ چہرے کا رنگ بار بار متغیر ہو رہا تھا۔ درس کے اختتام پر عبداللہ بن مبارک نے پوچھا تو بتایا کہ موزہ میں بچھو ہے۔

خودداری اور جلالت شان کے ساتھ حلم وعفو جو ایک گراں قدر جوہر ہے، اکثر جمع نہیں ہوا کرتا، لیکن امام مالک میں یہ دونوں صفتیں جمع تھیں۔ ایک طرف تو منصور ورشید جیسے قہار سلاطین کو ڈانٹ دیتے تھے اور دوسری طرف جب آپ کو کوڑے مارے جاتے ہیں تو بڑے آرام سے آپ برداشت کر لیتے ہیں اور پھر جب خلیفہ آپ کے ساتھ ہم دردی کرتے ہوئے، گورنر کی اس گستاخی کا ذکر کرتا ہے تو آپ کہتے ہیں کہ میں نے اسے معاف کر دیا ہے۔ آپ کو کوڑے مارے جانے کی تفصیل اس طرح سے ہے کہ محمد ذوالنفس الزکیہ نے ۱۴۵ھ میں مدینہ منورہ میں اور ان کے بھائی ابراہیم نے بصرہ میں جب سادات پر منصور کی زیادتیوں سے تنگ آ کر، علم بغاوت بلند کیا تو امام صاحب نے ان کا ساتھ دیا، جس کے نتیجے میں والیِ مدینہ جعفر بن سلیمان نے غضب ناک ہو کر امام دارالہجرہ کی پشت پر ۷۰ کوڑے لگوائے، تمام پیٹھ لہولہان ہو گئی، دونوں ہاتھ

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

مونڈھوں سے نکل آئے، پھر اونٹ پر بٹھا کر تمام شہر میں تشہیر کرائی گئی۔ امام صاحب اِس حالت میں یہ فرماتے جاتے تھے کہ جو مجھ کو جانتا ہے، وہ تو جانتا ہے جو نہیں جانتا، وہ جان لے کہ میں مالک بن انس ہوں۔ اور میں فتویٰ دیتا ہوں کہ جبری طلاق واقع نہیں ہوتی۔ امام صاحب کے اس فتویٰ کے پیچھے یہ معاملہ تھا کہ جب محمد نفس زکیہ نے بغاوت کا علم بلند کیا تو امام صاحب نے یہ فتویٰ دیا کہ خلافت نفس زکیہ کا حق ہے، لوگوں نے پوچھا کہ ہم تو خلیفہ منصور کی بیعت کر چکے ہیں۔ امام صاحب نے فرمایا کہ منصور نے بیعت جبراً لی ہے اور جو کام جبراً کرایا جائے، شرع میں اس کا اعتبار نہیں ہوتا۔ پھر جب خلیفہ منصور اس بغاوت کو سرد کرنے میں کامیاب ہو گیا تو جعفر بن سلیمان نے مدینہ پہنچ کر نئے سرے سے لوگوں سے بیعت لی اور امام مالک سے کہلا بھیجا کہ آیندہ جبری طلاق کے عدم اعتبار کا فتویٰ نہ دیں کہ اس کے نتیجے میں جبری بیعت بے وقعت ہو جائے۔ امام صاحب اس موقف سے نہ ہٹے، چنانچہ اس نے وہ ظلم اختیار کیا، جس کا ذکر ہم اوپر پڑھ آئے ہیں۔

۱۷۴ھ میں ہارون الرشید اپنے دونوں شہزادوں امین اور مامون کو لے کر حج کے لیے آیا اور موطا کے املا کے لیے امام مالک کو سراپردۂ خلافت میں طلب کیا۔ امام صاحب نے انکار کر دیا اور خود وہاں موطا کے بغیر تشریف لے گئے۔ ہارون الرشید نے شکایت کی تو امام صاحب نے فرمایا کہ علم تیرے گھر سے نکلا ہے، خواہ اس کو ذلیل کر، خواہ اس کی عزت کر۔ یہ سن کر ہارون الرشید متاثر ہوا اور اپنے بیٹوں امین اور مامون کو لے کر مجلس درس میں حاضر ہوا۔ وہاں طلبہ کا ہجوم تھا۔ ہارون رشید نے امام سے کہا کہ اس بھیڑ کو الگ کر دیجیے۔ امام صاحب نے فرمایا کہ شخصی افادہ کے لیے عام افادہ کا خون نہیں کیا جا سکتا۔ ہارون خاموش ہو گیا، پھر ایک اور واقعہ یہ ہوا کہ اسی مجلس میں ہارون رشید مسند پر بیٹھ گیا۔ امام صاحب نے فرمایا کہ اے امیر المومنین تواضع پسندیدہ ہے۔ یہ سن کر ہارون نیچے اتر گیا، پھر امام صاحب سے درخواست کی کہ آپ قرأت کیجیے۔ امام صاحب نے فرمایا: یہ خلاف عادت ہے اور اپنے شاگرد معن بن عیسیٰ کو قرأت کے لیے اشارہ کیا۔ چنانچہ انھوں نے قرأت کی اور ہارون اور شہزادوں نے سماعت کی۔

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

محمد وسیم اختر مفتی

عروہ بن زبیر

یہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا عہد حکومت تھا۔ مسلمان باہم شیر و شکر تھے۔ چار نوجوان مسجد حرام میں نماز سے فارغ ہوئے تھے۔ باتوں باتوں میں ہر ایک نے اپنے مستقبل کی تمناؤں کا ذکر کیا۔ ایک نے کہا کہ میری آرزو ہے کہ میں خلیفہ بنوں اور حرمین شریفین پر میرا جھنڈا لہرائے۔ دوسرے نے تمنا کی میں پوری اسلامی سلطنت کا خلیفہ بنوں اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی جانشینی مل جائے۔ تیسرے کا کہنا تھا کہ میری خواہش ہے کہ عرب وعجم میری فرماں روائی میں ہوں اور قریش کی دو خوب رو دوشیزائیں میری زوجیت میں آ جائیں۔ چوتھے نوجوان کا ارمان بالکل مختلف تھا۔ اس نے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ مجھے دنیا کے اندر علوم دینیہ میں کمال حاصل ہو جائے، مخلوق مجھ سے فیض یاب ہو اور آخرت میں جنت میں جگہ مل جائے۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ چاروں نوجوانوں کی مرادیں بر آئیں۔ پہلے نوجوان کا نام عبداللہ بن زبیر، دوسرے کا عبدالملک بن مروان، تیسرے کا مصعب بن زبیر اور چوتھا عروہ بن زبیر تھا۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

عروہ بن زبیر ۲۳ھ میں مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے۔ تب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کا آخری سال تھا۔ آپ کے والد زبیر بن عوام نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی صفیہ کے بیٹے تھے۔ ان کا شجرۂ نسب پانچویں پشت یعنی قصی بن کلاب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جا ملتا ہے۔ وہ عشرہ مبشرہ میں شامل تھے اور ان کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر نبی کا ایک حواری ہوتا ہے اور میرا حواری زبیر بن عوام ہے۔ حضرت عروہ کی والدہ بھی حسب ونسب والی تھیں۔ وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صاحب زادی اسما تھیں۔

اس زمانے میں اسلامی حکومت انتہائی وسیع ہو چکی تھی اور مسلمان خوش حال تھے۔ عروہ نے بڑی دل جمعی سے علم حاصل کیا۔ اپنے والد زبیر اور بھائی عبداللہ کے علاوہ، حضرت علی، حضرت سعید بن زید، حضرت زید بن ثابت، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت ابوایوب انصاری، حضرت اسامہ بن زید، حضرت نعمان بن بشیر اور حضرت ابوہریرہ رضی

اللہ عنہم سے کسب فیض کیا۔ عورتوں میں سے آپ کی والدہ حضرت اسما، خالہ حضرت عائشہ، حضرت ام حبیبہ، حضرت ام سلمہ اور حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہن نے آپ کی تربیت میں حصہ لیا۔ آپ تابعین سے علم حاصل کرنے میں بھی پیچھے نہ رہے۔ نافع بن جبیر، حضرت عثمان کے آزاد کردہ غلام حمران اور ابوسلمہ بن عبدالرحمان ان میں شامل ہیں۔

سب سے بڑھ کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے بھانجے کی تربیت کی۔ وہ خود فرماتے ہیں: میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی وفات سے چار سال پہلے ان سے تمام علوم سیکھ چکا تھا اور ان کی روایت شدہ تمام احادیث مجھے زبانی یاد تھیں۔ آپ کو قرآن مجید سمجھنے میں کوئی دشواری پیش آتی تو فوراً حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے رجوع کرتے۔ چنانچہ سعی بین الصفا والمروہ کے بارے میں آپ کے اشکال کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی نے دور کیا۔ عروہ کا کہنا تھا کہ قرآن کے الفاظ سے لگتا ہے کہ یہ سعی ضروری نہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا: بات یہ نہیں، بلکہ ہم دور جاہلیت میں سعی کو گناہ سمجھتے تھے اور ہمارے استفسار پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد نازل ہوا کہ اس میں گناہ کی کوئی بات نہیں۔ اسی طرح سورۂ یوسف کی آخری سے پہلے والی آیت کے بارے میں انھوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا تو انھوں نے بتایا کہ جھوٹے وعدے کا گمان کرنے والے رسول نہیں، بلکہ ان کے پیروکار ہیں۔ لہٰذا آیت کا صحیح ترجمہ یوں ہوگا: ''یہاں تک کہ جب پیغمبر لوگوں سے مایوس ہو گئے اور لوگوں نے بھی سمجھ لیا کہ ان سے جھوٹ بولا گیا تھا تو یکا یک ہماری مدد پیغمبروں کو پہنچ گئی۔''

علم حدیث میں آپ کو کمال حاصل تھا۔ اس کی دلیل وہ اسناد ہیں جو اب بھی کتب حدیث میں موجود ہیں۔ ان میں بے شمار دفعہ عروہ کا نام آیا ہے۔ زہری کہتے ہیں کہ وہ ایک اتھاہ سمندر کی حیثیت رکھتے تھے۔ عمر بن عبدالعزیز ان کو بڑا عالم سمجھتے تھے اور سب محدثین نے ان کو کثیر الحدیث اور ثقہ مانا ہے۔

علم فقہ میں عروہ کی مہارت مانی جاتی ہے۔ انھیں مدینے کے سات فقہا میں شامل کیا گیا جن کا فیصلہ حرف آخر سمجھا جاتا تھا۔ فقہائے سبعہ میں سعید بن مسیّب، عروہ بن زبیر، خارجہ بن زید بن ثابت، عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ، قاسم بن محمد بن ابوبکر صدیق، ابوبکر بن عبدالرحمان بن حارث اور سلیمان بن یسار شامل ہیں۔ آپ حضرت عمر بن عبدالعزیز کی دس فقہا پر مشتمل مجلس مشاورت میں بھی شامل تھے۔

رائج علوم کی تحصیل سے فارغ ہونے کے بعد آپ مسند تدریس پر فائز ہوئے جو آپ کی بچپن کی آرزو تھی۔ مسجد نبوی میں آپ کا حلقۂ درس پر ہجوم ہوتا۔ حضرت عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ بتاتے ہیں کہ صحابہ بھی ان سے مسائل دریافت کرتے تھے۔ آپ نے فقہ میں کئی کتابیں لکھیں۔ واقدی کہتے ہیں کہ وہ پہلے آدمی تھے جنھوں نے مغازی میں کتاب لکھی۔ اس زمانے میں لوگ کتاب اللہ کے علاوہ کوئی تحریر لکھنا پسند نہ کرتے تھے۔ عروہ نے بھی حرہ کی جنگ کے بعد اپنی کتابیں ضائع کر دیں، تاہم بعد میں افسوس کرتے کہ اب کتاب اللہ کا متن مستحکم ہو چکا ہے اور اس میں آمیزش کا خطرہ نہیں رہا، کاش میری کتابیں محفوظ ہوتیں۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

آپ کے شاگردوں میں سے تمیم بن ابوسلمہ، سعد بن ابراہیم ،سلیمان بن یسار، عبداللہ بن ذکوان ،عبداللہ بن عروہ، عطابن ابورباح، علی بن زید، عمروبن دینار، زہری، محمد بن منکدر اور یحییٰ بن ابوکثیر مشہور ہیں۔علم وفضل کا حامل ہونے کے ساتھ عروہ عبادت گزار بھی تھے۔ ہر روز مصحف میں سے دیکھ کر ربع قرآن تلاوت کرتے اور پھر تہجد میں اسے دہراتے۔نماز خشوع وخضوع سے پڑھتے۔ایک شخص کو جلدی جلدی مختصر نماز پڑھتے دیکھا تو اسے کہا، کیا تمھیں اپنے رب سے کچھ مانگنا نہیں ہوتا۔مسلسل روزے رکھتے۔جس روز انتقال ہوا،اس دن بھی روزے سے تھے۔

آپ کسی کام سے ولید بن عبدالملک سے ملنے دمشق گئے۔راستے میں آپ کے پاؤں میں ورم آ گیا اور اس نے ایک مہلک پھوڑے کی شکل اختیار کر لی اس کا زہر اوپر کی طرف پھیلنا شروع ہوا تو دمشق کے اطبا نے اسے کاٹنے کا مشورہ دیا۔آپ کو کہا گیا کہ تھوڑی سی شراب پی لیں تو آپریشن آسان ہو جائے گا، لیکن آپ نے ذکر وتسبیح اور نماز میں مشغول ہونے کو ترجیح دی۔اسی حالت میں آپ کا پاؤں کاٹا گیا۔ولید بھی پاس بیٹھا باتیں کر رہا تھا،اسے خبر تک نہ ہوئی ،البتہ جب آخر میں گوشت جلا کر خون بند کیا گیا تو اس کی بو سے اسے معلوم ہوا کہ پاؤں کٹ چکا ہے۔آخر میں عروہ بے ہوش ہو گئے۔آپریشن کے بعد بھی آپ نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اے اللہ تو نے ایک عضو لیا اور تین باقی رہنے دیے۔

اسی سفر میں آپ کو ایک اور صدمہ پیش آیا۔آپ کا بڑا بیٹا محمد جو آپ کا رفیق سفر تھا۔چھت سے اصطبل میں جا گرا اور گھوڑوں نے اسے کچل دیا۔تب بھی آپ نے صبر کیا اور کہا کہ اللہ شکر ہے۔تو نے سات بیٹوں میں سے ایک کو وفات دی اور چھ کو زندہ رکھا ہے۔واپسی پر جب پاؤں میں درد شروع ہوا تو سورۂ کہف کی یہ آیت پڑھی: اتنا کہا: 'لَقَدْ لَقِيْنَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا' (ہمیں اپنے اس سفر میں بڑی مشقت کا سامنا کرنا پڑا ہے)۔

اس واقعے کے بعد آٹھ سال تک آپ زندہ رہے۔آپ نیکی کے کاموں میں حصہ لیتے رہے۔مدینے میں ایک کنواں کھدوایا جو بیر عروہ کے نام سے مشہور ہے اور ٹھنڈا میٹھا پانی دیتا ہے۔جب آپ کے باغات میں کھجوریں اور پھل لگتے تو اس کی دیوار میں شگاف ڈال دیتے تا کہ لوگ خوب فائدہ اٹھالیں۔آپ شاعری سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔اپنے بھائی عبداللہ بن زبیر کی شہادت کے بعد عبدالملک بن مروان سے اپنے بھائی کی تلوار لینے گئے۔انھوں نے بہت سی تلواریں آپ کے آگے ڈھیر کر دیں۔آپ نے جھٹ سے عبداللہ بن زبیر کی تلوار نکال لی۔عبدالملک نے پوچھا، آپ نے تلوار کیسے پہچانی۔انھوں نے کہا کہ اصل میں یہ میرے والد زبیر بن عوام کی تلوار تھی اور انھوں نے جنگ بدر میں اسے استعمال کیا تھا،تب سے اس میں ایک دندانہ پڑا ہوا ہے پھر ایک شعر پڑھا جس کا مفہوم یہ ہے کہ ان تلواروں میں بس اتنا ہی عیب ہے کہ لشکروں سے ٹکرانے کے باعث ان میں دندانے پڑے ہوئے ہیں۔

عروہ خوش لباس تھے۔بالوں پر خضاب لگاتے۔چار بیویوں اور دو باندیوں سے ان کے اٹھارہ بچے ہوئے۔ان میں سے یحییٰ، ہشام عبداللہ اور عثمان نے روایت حدیث میں بڑا حصہ لیا۔

علی بن حسین زین العابدین اور عروہ نماز عشا کے بعد مسجد نبوی کے آخری حصے میں بیٹھ جاتے اور باہم گفتگو کرتے۔ایک دن بنو امیہ کے مظالم کا ذکر چھڑ گیا تو دونوں نے مشورہ کیا کہ ان میں گھل مل کر رہنا اوران پر نکیر نہ کرنا عذاب الٰہی کا باعث بن سکتا ہے۔عروہ نے مشورہ دیا کہ ظالموں سے چند میل دور رہ لینا ہی مناسب ہے، چنانچہ وہ عقیق میں منتقل ہو گئے۔

آپ کی وفات ۹۴ ہجری میں آپ کے باغات میں ہوئی جو فرع کے مقام پر تھے۔ وہیں آپ کو دفن کیا گیا۔اس سال کو فقہا کی موت کا سال کہا جاتا ہے۔آغاز میں علی بن حسین زین العابدین فوت ہوئے، پھر عروہ بن زبیر، سعید بن مسیّب اور آخر میں ابوبکر بن عبدالرحمان بن حارث اللہ کو پیارے ہوئے۔

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

روز جزا اللہ کی رحمت کا تقاضا ہے

انسان جب خدا کی پروردگاری کے اہتمام کو دیکھتا ہے تو یہیں سے اس پر علم و معرفت کا ایک اور دروازہ کھلتا ہے۔ یہ دروازہ ایک روز جزا و سزا کی آمد کا دروازہ ہے۔ جس دن تنہا وہی، پورے اختیار کے ساتھ انصاف کی کرسی پر بیٹھے گا اور نافرمانوں کو ان کی نافرمانیوں کی انصاف کے ساتھ سزا دے گا اور نیکوں کو ان کی نیکیوں کا فضل و رحمت کے ساتھ صلہ دے گا۔

خدا کی پروردگاری اور اس کی رحمانیت اور رحیمیت کی نشانیاں ایک روز جزا و سزا کی آمد کو کس طرح لازم کرتی ہیں؟ اس سوال کا جواب تھوڑی سی وضاحت کا طالب ہے۔

خدا کی پروردگاری سے روزِ جزا پر استدلال قرآنِ مجید نے جگہ جگہ اس طرح کیا ہے کہ جس خدا نے تمھارے لیے زمین کا فرش بچھایا اور آسمان کا شامیانہ تانا، جس نے تمھارے لیے سورج اور چاند چمکائے، جس نے ابر و ہوا جیسی چیزوں کو تمھاری خدمت میں لگایا، جس نے تمھارے تمام ظاہری اور باطنی، روحانی اور مادی مطالبات کا بہتر سے بہتر جواب مہیا کیا، کیا اس خدا کے متعلق تم یہ گمان کرتے ہو کہ بس اس نے تمھیں یوں ہی پیدا کر دیا ہے اور پیدا کر کے بس یوں ہی چھوڑ دے گا؟ یہ تمام کارخانہ محض کسی کھلنڈرے کا ایک کھیل ہے جس کے پیچھے کوئی غایت و مقصد نہیں ہے؟ تم ایک شترِ بے مہار کی طرح اس سرسبز و شاداب چراگاہ میں بس چرنے کے لیے چھوڑ دیے گئے ہو، نہ تم پر کوئی ذمہ داری ہے اور نہ تم سے کوئی پرسش ہوگی؟ اگر تم نے یہ سمجھ رکھا ہے تو نہایت غلط سمجھ رکھا ہے۔ پرورش کا یہ سارا اہتمام پکار پکار کر شہادت دے رہا ہے کہ یہ اہتمام کسی اہم غایت و مقصد کے لیے ہے اور یہ ان لوگوں پر نہایت بھاری ذمہ داریاں عاید کرتا ہے جو بغیر کسی استحقاق کے اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ایک دن ان ذمہ داریوں کی بابت ایک ایک شخص سے پرسش ہوگی اور وہی دن فیصلہ کا ہوگا۔ جنھوں نے اپنی ذمہ داریاں ادا کی ہوں گی، وہ سرخ رو اور فائز المرام ہوں گے اور جنھوں نے ان کو نظر انداز کیا ہوگا، وہ ذلیل اور نامراد ہوں گے۔

یہ مضمون قرآنِ مجید میں مختلف اسلوبوں سے بیان ہوا ہے، لیکن اختصار کے خیال سے صرف ایک مثال نقل کرتے ہیں:

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

’’کیا ہم نے زمین کو تمھارے لیے گہوارا نہیں بنایا اور اس میں پہاڑوں کی میخیں نہیں ٹھونکیں؟ اور ہم نے تم کو جوڑا جوڑا پیدا کیا۔ اور تمھاری نیند کو دافعِ کلفت بنایا۔ رات کو تمھارے لیے پردہ پوش بنایا اور دن کو حصولِ معاش کا وقت ٹھیرایا اور ہم نے تمھارے اوپر سات مضبوط آسمان بلند کیے اور روشن چراغ بنایا اور ہم نے بدلیوں سے دھڑا دھڑ پانی برسایا تاکہ اس سے ہم غلے اور نباتات اگائیں اور گھنے باغ پیدا کریں۔ بے شک فیصلہ کا دن مقرر ہے۔‘‘ (النبا ۷۸: ۶۔ ۷)

’’بے شک فیصلہ کا دن مقرر ہے۔‘‘ یعنی یہ چیزیں اس بات کی گواہی دے رہی ہیں کہ جس نے یہ کچھ اہتمام انسان کے لیے کیا ہے، وہ انسانوں کو یوں ہی شترِ بے مہار کی طرح چھوڑے نہیں رکھے گا بلکہ اس کی نیکی یا بدی کے فیصلے کے لیے فیصلہ کا ایک دن بھی لائے گا۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے رحمان اور رحیم ہونے کا یہ لازمی نتیجہ قرار دیا ہے کہ ایک ایسا دن بھی وہ لائے جس میں اچھوں اور بروں کے درمیان انصاف کرے، نیکوکاروں کو ان کی نیکیوں کا صلہ دے، اور بدکاروں کو ان کی برائیوں کی سزا دے۔ ایک رحمان اور رحیم ہستی کے لیے یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ ظالم اور مظلوم، نیکوکار اور بد، باغی اور وفادار دونوں کے ساتھ ایک ہی طرح کا معاملہ کرے، ان کے درمیان ان کے اعمال کی بنا پر کوئی فرق نہ کرے۔ نہ ظالم کو اس کے ظلم کی سزا دے نہ مظلوم کی مظلومیت کا ظالم سے انتقام لے۔ اگر زندگی کا یہ کارخانہ اسی طرح ختم ہو جاتا ہے، اس کے بعد جزا و سزا اور انعام و انتقام کا کوئی دن آتا نہیں ہے تو اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ العیاذ باللہ اس دنیا کے پیدا کرنے والے کی نگاہوں میں متقی اور مجرم دونوں برابر ہیں بلکہ مجرم نسبتاً اچھے ہیں جن کو جرم کرنے اور فساد برپا کرنے کے لیے اس نے بالکل آزاد چھوڑ رکھا ہے۔ یہ چیز بداہتہً غلط اور اس کے رحمان اور رحیم ہونے کے بالکل منافی ہے چنانچہ اس نے نہایت واضح الفاظ میں اس کی تردید فرمائی۔ مثلاً:

’’کیا ہم اطاعت کرنے والوں کو مجرموں کی طرح کر دیں گے، تمھیں کیا ہو گیا ہے، تم کیسا فیصلہ کرتے ہو؟‘‘

(القلم ۶۸: ۳۶)

اور اپنے رحمان اور رحیم ہونے کا یہ لازمی نتیجہ بتایا ہے کہ ایک دن وہ سب کو جمع کر کے انصاف کرے گا اور ہر ایک کو اس کے اعمال کے مطابق بدلہ دے گا۔ چنانچہ فرمایا ہے:

’’اس نے اپنے اوپر رحمت واجب کر لی ہے، وہ قیامت تک، جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں ہے، تم کو ضرور جمع کر کے رہے گا۔‘‘ (الانعام ۶: ۱۲)

اس سے صاف واضح ہے کہ قیامت دراصل خدا کی رحمت کا مظہر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر رحمت واجب کر رکھی ہے۔ اس وجہ سے وہ فیصلے کا ایک دن ضرور لائے گا جس میں وہ سب کو اکٹھا کر کے ان کے درمیان انصاف فرمائے گا۔ اور یہ بھی عین اس کی اس رحمت ہی کا تقاضا ہے کہ اس دن کسی کو مجال نہ ہو گی کہ اس کے فیصلوں میں کوئی مداخلت کر سکے اور اپنی سفارشوں سے حق کو باطل یا باطل کو حق بنا سکے، بلکہ ہر ایک کے لیے بالکل بے لاگ اور پورا پورا انصاف ہو گا۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اس سے یہ نکتہ بھی واضح ہوا کہ عدل اور رحمت میں کوئی تضاد نہیں ہے بلکہ عدل عین رحمت ہی کا تقاضا ہے۔

ـــــــ امین احسن اصلاحی

موت سے پہلے

زندگی اور موت کی کشاکش جاری ہے۔ جس طرح لوگ دنیا میں آ رہے ہیں، اسی طرح رخصت بھی ہو رہے ہیں۔ انسانی زندگی کے خاتمے کا کوئی وقت معین نہیں۔ جہاں، جس وقت، جس عمر میں فیصلہ ہو جاتا ہے، لوگ بلا لیے جاتے ہیں۔ کوئی طبیب، کوئی مسیحا اور کوئی عمل اور کوئی وظیفہ اس فیصلے کو ٹالنے کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔

ہم حادثات کا شکار ہوتے ہیں۔ ہمیں بیماری سے سابقہ پڑتا ہے۔ ہم جوانی کی رعنائیوں سے بڑھاپے کی ناتوانیوں تک سفر پر مجبور ہیں۔ یہ زندگی انھی حقیقتوں سے عبارت ہے۔ ہماری آج تک کی کاوشیں اس حقیقت میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کر سکیں۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

عالم کے پروردگار نے خبر دی ہے کہ زندگی اور موت کا یہ سفر اپنی ایک غایت رکھتا ہے۔ ایک نیا جہان آباد ہونا ہے۔ انتہائی خوب صورت جہاں، جس میں موت کا آزار نہیں، جس میں بیماریاں اور حادثات نہیں، جس میں بڑھاپے کا تصور نہیں، غریبی اور ناداری نہیں، معذوری اور مجبوری نہیں، بلکہ جس میں دل پسند نعمتیں ہیں، جس میں زندگی کی ساری رعنائیاں جمع کر دی گئی ہیں۔ کھانے اور پھل ایسے کہ لوگ تصور نہیں کر سکتے۔ بستر اور لباس ایسے کہ بادشاہوں کو نصیب نہیں۔ کمرے اور محل ایسے کہ سلاطین کے عظیم مسکن ان کے سامنے بے حقیقت ہو جائیں۔ پھر یہ سب کچھ ابدی ہے۔ نہ اس میں دکھ ہے نہ الم۔ اور نہ کھوئے جانے کا کھٹکا۔ نہ اس میں کمی کا اندیشہ ہے۔ نہ مستقبل پر اوہام کا پردہ پڑا ہوا کہ آدمی اسے بنانے یا محفوظ کرنے کے تردد میں پڑا رہے۔

یہ شان دار دنیا ہر آدمی پا سکتا ہے۔ سب کو برابر کا موقع حاصل ہے۔ دنیا کی بے خطا جدوجہد بھی ناکام ہو سکتی ہے، لیکن آخرت کے لیے کیا ہوا ذرہ برابر اہتمام بھی رائگاں جانے والا نہیں۔ شرط صرف یہ ہے کہ آدمی 'احسن عملا' (ملک ۶۷:۲) ہو۔ وہ خدا کی بندگی کے تقاضے پورے کرے۔ خدا کے پہلو سے بھی اور انسانوں کے پہلو سے بھی۔ اگر یہ منزل اس نے پا لی تو وہ دنیا اس کی ہے۔ اس دنیا سے اسے کوئی محروم نہیں کر سکتا۔ یہ دنیا کیا ہے؟ جس نے پا لی ہے، اس سے بھی عنقریب چھن جانے والی ہے۔

ـــــــ طالب محسن

اخلاقی اقدار

کسی نے پوچھا: اخلاقی اقدار کی بنیاد کیا ہے۔ دانش وروں نے جواب دیا: اخلاقی اقدار کی بنیاد سماجی ڈھانچے پر ہے اور سماجی ڈھانچے کے بہت سے عناصر طرز معیشت سے براہ راست متعلق ہوتے ہیں۔ اپنی بات کی تفصیل کرتے ہوئے وہ بتاتے ہیں کہ چوری ایک جرم ہے، لیکن اس کا تصور اس وقت سامنے آیا جب چیزوں کو ذاتی ملکیت کی حیثیت حاصل ہوئی۔ عورت کے حقوق جاگیر دارانہ معاشرے میں اور ہیں اور موجودہ صنعتی معاشرے میں اور۔ بہت سی اخلاقی اقدار مفادات کے تحفظ کے لیے رائج کی گئیں۔ مثلاً وفاداری اور نمک حلالی کی اقدار کو رائج کر کے نوابوں، جاگیر داروں اور بادشاہوں نے اپنی رعایا کو اپنے استحصالی نظام میں جکڑے رکھا۔ اس تجزیے سے وہ ایک دلچسپ نتیجہ بھی نکالتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر معیشت کے نظام کو نئے خطوط پر استوار کر دیا جائے تو چند ہی برسوں میں بہت سی اقدار دم توڑ دیں گی اور انسانی ضمیر نئے پیمانوں سے اپنا فریضۂ ملامت انجام دے گا۔ ان کی سب سے زیادہ دل چسپی عورت کی آزادی سے ہے۔ ان کے نزدیک اگر مرد اور عورت کو کمائی کے یکساں مواقع میسر ہوں تو عورت مرد کے چنگل سے نکل جائے گی۔ بیوی کا روایتی تصور ختم ہو جائے گا اور مرد و عورت کے حقوق و اختیارات بالکل یکساں ہو جائیں گے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.org

حقیقت یہ ہے کہ اخلاقی اقدار کے بارے میں یہ نقطۂ نظر بڑا سطحی ہے۔ یہ اہل مذہب کی اس رائے کو باطل کرنے کی کوشش ہے کہ اخلاقی اقدار ایک مستقل حیثیت رکھتی ہیں۔ اہل مذہب کا استدلال یہ ہے کہ ان اقدار کا ماخذ وہ فطرت ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ یہ فطرت ہمیشہ سے ایک ہے اور ایک ہی رہے گی۔ بعض برے عوامل اور حالات اسے غیر موثر یا معطل ضرور کر دیتے ہیں اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ فطرت کی اپنی کوئی اصل صورت نہیں ہے، لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔

اس معاملے میں غلطی لگنے کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں نے اخلاقی اقدار کے پیچھے کارفرما اصولوں اور ان کی عملی صورتوں کو ایک ہی سمجھ لیا ہے۔ حالانکہ ان دونوں میں بہت فرق ہے۔ مثلاً، دیکھیے، مہمان نوازی ہر معاشرے کی قدر ہے۔ لیکن اس کے اظہار کے طریقے ہر ماحول میں مختلف ہیں۔ مہمان کا دروازے میں آ کر استقبال کیا جائے یا نہیں، اس سے مصافحہ ہوگا یا معانقہ، کھانا پر تکلف ہوگا یا سادہ، کھانا کھلاتے ہوئے اصرار کیا جائے گا یا محض پیش کر دینا ہی کافی ہے۔ رخصت کرتے ہوئے دروازے تک رخصت کیا جائے گا یا نشست ہی سے، یہ سب امور مختلف ہو سکتے ہیں۔ کہیں ایک امر کو مہمان نوازی کا تقاضا سمجھا جائے گا اور کہیں دوسرے کو، لیکن ان سب اعمال کے پیچھے کارفرما ایک ہی قدر یعنی مہمان نوازی ہے۔

اگر تمام معاشرتی اقدار کو کسی ایک لڑی میں پرونا چاہیں تو وہ خیر خواہی ہے۔ اسی خیر خواہی کے مظاہر عدل، محبت، سخاوت، مساوات، آزادی کے الفاظ کا روپ دھارتے ہیں۔ یہ مظاہر بھی ایک حد تک ہر معاشرے میں یکساں ہیں، لیکن ان کے اطلاق کی صورتیں مختلف ہو جاتی ہیں۔ یہ چیز اس دھوکے کا باعث بنتی ہے کہ اقدار ایک تغیر پذیر معاشرتی معاملہ ہے۔

تمام اخلاقی اقدار میں اصل اصول کی حیثیت ایک دوسرے کی خیر خواہی کو حاصل ہے۔ یہی حقیقت ہے جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے 'الدین النصیحة' کے لافانی الفاظ میں بیان کر دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سوال کے جواب میں یہ بھی واضح فرما دیا کہ اس خیر خواہی کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ یہ انسان کی اپنی ذات سے لے کر معاشرے، حکومت یہاں تک کہ دین اور خدا کے لیے بھی مطلوب ہے۔

ـــــ طالب محسن

سازش اغیار کا فلسفہ

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

مقدمہ یہ ہے کہ اسلام اور مسلمان ایک سازش کی زد میں ہیں جس کا تانا بانا اغیار نے کمال مہارت کے ساتھ بنا ہے۔ آج مسلمان معاشرے داخلی اور خارجی طور پر جن مسائل کا شکار ہیں وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اسی سازش کے مختلف مظاہر ہیں۔ یہ فرقہ واریت، مساجد اور امام بارگاہوں پر حملے، مذہبی انتہا پسندی، یہ سب ہمارے دشمنوں کا کمال ہے۔ اب یہ کہا جا رہا ہے کہ اعتدال پسند اسلام (Moderate Islam) کے نام سے جو تعبیر دین پیش کی جا رہی ہے، یہ بھی دراصل سی آئی اے کی سازش ہے۔ اس مقدمے کے حق میں سب دلائل بھی وہیں سے آ رہے ہیں، جہاں اس سازش کا منبع ہے، یعنی انھی لوگوں کے بیانات اور تحریریں جو یہ سازش تیار کرنے والے ہیں۔ گویا ہم سازش کے اثبات کے ساتھ ان کی صداقت کی بھی گواہی دے رہے ہیں۔

یہ مقدمہ کچھ ایسا نیا نہیں۔ مسلمانوں کی صدیوں پر پھیلی تاریخ سے اس کے بے شمار شواہد اس سے پہلے بھی پیش کیے جاتے رہے ہیں۔ اگر مسلمانوں کے باہمی اختلافات پر نظر ڈالیے تو ہر فرقہ دوسرے کے وجود کو کسی ایرانی، عجمی یا یہودی سازش کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ اس مقدمے میں صحت کتنی ہے، اس سے تھوڑی دیر کے لیے صرف نظر کرتے ہوئے، آیئے، اس نقطۂ نظر کا اس پہلو سے جائزہ لیں کہ اس کو صحیح مان لینے کے نتیجے میں مسلمانوں کی نفسیات پر اس کے کیا اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر ہر واقعہ اور ہر حادثہ کسی سازش کا نتیجہ ہے تو اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا دشمن اتنا طاقت ور اور ذہین ہے کہ ہم عملاً اس کے سامنے بے بسی کی تصویر بن گئے ہیں۔ دنیا کی عسکری قوت اس کے پاس ہے۔ تمام میڈیا اس کی دسترس میں ہے۔ وہ چاہے تو طاقت سے ہمیں نیست و نابود کر دے اور وہ ہماری شکل جیسی چاہے، دنیا کو دکھا دے۔ لہٰذا ہمارے پاس اب دو راستے ہیں: ہم کہیں سے وسائل جمع کریں اور طاقت کے ان ایوانوں کو آگ لگا دیں یا پھر دنیا کی سیاست و معیشت سے لاتعلق ہو جائیں اور لوگوں کو محض رجوع الی اللہ کی وہ دعوت دیں جس کا ایک مظہر ہماری تبلیغی جماعت ہے۔ اگر یہ بات درست ہے تو پھر اس مسئلے کا کیا حل ہے کہ بعض لوگوں کے نزدیک یہ انتہا پسندی دشمنوں کی سازش ہے اور بعض کا کہنا یہ ہے کہ امور دنیا سے مسلمانوں کو لاتعلقی کی تعلیم دینا بھی دراصل دشمن ہی کی ایک چال ہے۔ اللہ کے یہ سادہ دل بندے اب کدھر جائیں؟

دوسری بات یہ ہے کہ سازش کا یہ نظریہ مسلمانوں کو ردعمل کے مقام پر لا کھڑا کرتا ہے۔ وہ اپنے زوال کا اگر کوئی حل تلاش کرتے ہیں تو وہ ردعمل اور دفاعی حکمت عملی پر مبنی ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کھیل کے قواعد وضوابط کا تعین کبھی مسلمانوں کے ہاتھ میں نہیں آسکتا۔ اسی طرح یہ انداز فکر انھیں مثبت رویے سے محروم کر دیتا ہے۔ وہ یہ فرض کر لیتے ہیں کہ ہمیں تو مرنا ہی ہے، کیوں نہ دشمن کے چند لوگ لے مریں۔ یہ مایوسی کی انتہائی شکل کا ظہور ہے۔ اسامہ بن لادن کی تحریک اور پھر خود کش حملوں کے رجحان میں اسی نفسیات کا دخل ہے۔ جو لوگ بحیثیت قوم اس موقف کو اپنا لیں، ان کے لیے کسی اچھے مستقبل کی پیش گوئی مشکل ہو جاتی ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ سازش کا فلسفہ پورے معاشرے پر شک کی ایک ایسی چادر تان دیتا ہے، جس کے بعد ہر آدمی دوسرے آدمی کو مشکوک نظروں سے دیکھتا ہے۔ ہر فرد کو دوسرا فرد دشمن کا ایجنٹ دکھائی دیتا ہے۔ ذرا غور کیجیے، اگر اسلام کی انتہا پسندانہ تعبیر سازش ہے، ماڈریٹ اسلام سازش ہے، معاشرے کو سیکولر بنانے کی کوششیں تو ہیں ہی سازش تو پھر اس کے بعد ہمارے معاشرے میں آخر وہ کون ہے جو کسی نہ کسی سازش کا شکار نہیں۔ اگر دینی مدارس میں بھی ایک سازش کے تحت لوگ داخل کیے جا رہے ہیں تو ان اداروں کے فارغ التحصیل لوگوں میں سے کس کے بارے میں یہ یقین سے کہا جا سکے گا کہ اس کا وجود کسی سازش کا مظہر نہیں ہے۔ این جی اوز کے بارے میں ہمیں پہلے ہی حق الیقین ہے کہ وہ اغیار کی سازش ہے۔ اب اس معاشرے میں کون ہے جو سازشی نہیں یا کسی سازش کا شکار نہیں؟ شک کی یہ فضا ہمیں ایک ایسے مقام پر لا کھڑا کرتی ہے کہ ہمیں اپنے بھائی پر بھی اعتبار نہیں رہتا۔ شک کا یہ فلسفہ افراد کے درمیان ایسی دیواریں کھڑی کر دیتا ہے، جس کے بعد، کسی وحدت فکر وعمل کا امکان باقی نہیں رہتا۔

اگر ہم سازش کے اس نظریے کے دیگر نفسیاتی اثرات سے آنکھیں بند کر لیں تو یہی تین اثرات یہ بتانے کے لیے کافی ہیں کہ اس نظریے کی اشاعت اور ترویج ہمیں کس نفسیاتی بحران میں مبتلا کر رہی ہے۔ مجھے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

خلاف اس سے بڑی سازش کوئی نہیں ہوسکتی کہ انھیں سازش کی نفسیات میں مبتلا کر دیا جائے۔ اس کے بعد ان میں ساری عمر کسی مثبت سوچ کے پیدا ہونے کا امکان خود بخود ختم ہو جائے گا۔

اگر اس تجزیے سے اتفاق کر لیا جائے تو پھر یہ سوال غیر متعلق ہو جاتا ہے کہ سازش کے اس مقدمے میں کتنی صحت ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دنیا میں ہر قوم کے پاس جینے کا صرف ایک راستہ ہے کہ وہ اپنے مسائل پر ٹھنڈے دل سے غور کرے اور اپنے فکری اور عملی ارتقا اور ترقی کے لیے ایک مثبت لائحہ عمل اختیار کرے۔ وہ سب سے پہلے یہ سوچے کہ کیا بات اس کے لیے درست ہے اور کیا غلط۔ اس انداز فکر کے نتیجے میں اس کے اندر یہ شعور پیدا ہوگا کہ وہ باہر کی دنیا سے ایک مثبت تعلق استوار کرے۔ اس کے بعد اگر باہر سے آنے والی کوئی چیز ایسی ہے جو اس کے ارتقا میں معاون ہے تو اسے اختیار کرنے میں اسے کوئی تامل نہیں ہوگا۔ اسی طرح اگر کوئی چیز اس کے ملی وجود کے لیے غیر مفید ہے تو معاشرہ اسے خود بخود اگل دے گا۔ مثال کے طور پر ہمارے ہاں بہبود آبادی کے لیے جاری مہم زیادہ تر باہر سے آنے والے وسائل سے چلتی ہے۔ اب ہمیں سوچنا ہے کہ کیا آبادی کا بڑھنا فی الواقعہ ہمارے مسائل میں اضافہ کر رہا ہے۔ کیا ہمارے ہاں فرد کی اس حوالے سے تربیت کی جانی چاہیے کہ وہ اپنے خاندان کی فلاح و بہبود کے لیے ایک منصوبہ بنائے۔ اس باب میں ہماری دینی اور تہذیبی روایات کیا کہتی ہیں۔ جب ایک فرد اور ایک قوم ان سوالات پر غور کریں گے تو انھیں اندازہ ہو جائے گا کہ باہر سے آنے والے ہوا کے اس جھونکے کے لیے انھیں اپنی کھڑکی کھولنی چاہیے یا نہیں۔ پھر یہ بات خود بخود غیر متعلق ہو جائے گی کہ یہ مہم کسی سازش کا نتیجہ ہے یا نہیں ہے۔

دنیا میں پیدا ہونے والا ہر مسئلہ کسی سازش کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ بہت سے مسائل انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی حماقتوں کے نتائج ہوتے ہیں، جس سے ہر قوم دوچار ہو سکتی ہے۔ امریکی صدر بش نے ایسی حکمت عملی اختیار کی ہے جو ظلم پر مبنی اور انسانی فطرت سے متصادم ہے۔ اس کے بعض ناگزیر نتائج نکلیں گے جس سے وہ انفرادی طور پر اور امریکی قوم اجتماعی طور پر متاثر ہو گی۔ اسی طرح ہم نے افغانستان میں ایک حکمت عملی اختیار کی جس کے نتائج سے ہم بچ نہیں سکتے تھے۔ مثبت انداز فکر خود احتسابی کا جذبہ پیدا کرتا اور ایسی حماقتوں سے انسانوں کو محفوظ رکھتا ہے اور سازشوں کے اثرات سے بھی۔

مسلمانوں کی تاریخ میں قرآن مجید کو محرف ثابت کرنے کی سازش ہوئی۔ اللہ کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و اعمال کی روایت کو مشکوک ثابت کرنے کی کوشش ہوئی اور پوری تاریخ کو مسخ کرنے کی سعی بھی کی گئی۔ آج تاریخی اعتبار سے یہ ثابت ہے کہ ہمارے پاس وہی قرآن ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔ ہمارے پاس اعمال پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا ایسا ریکارڈ موجود ہے جس کی رسول اللہ سے روایت میں کوئی شک نہیں کیا جا سکتا۔ یہ نتیجہ ہے مسلمانوں کی ان مثبت کوششوں کا جو انھوں نے قرآن مجید کو تحریف سے محفوظ رکھنے اور سنت رسول کے عملی تواتر کو باقی رکھنے کے لیے کیں۔ تاریخ کے باب میں اس نوعیت کی کوئی بڑی کوشش نہیں ہوئی، اس لیے اس میں رطب و یابس سب کچھ موجود ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

میرا کہنا یہ ہے کہ مسلمانوں کے مسائل کا حل داخل میں ہے خارج میں نہیں۔ اسلام قرآن وسنت کی محکم اور یقینی بنیادوں پر کھڑا ہے، ان کی موجودگی میں حق ہمیشہ باقی رہے گا اور اس کی کوئی غلط تعبیر مسلمانوں میں عمومی طور پر جگہ نہیں پا سکتی۔ ان گمراہ فرقوں کی داستانیں اس کی گواہ ہیں جنھوں نے مسلمانوں میں جنم لیا اور پھر دم توڑ گئے۔ رہی بات مسلمانوں کی تو ان کی اپنی اور پھر دنیا کی ترقی یافتہ اقوام کی تاریخ گواہ ہے کہ قوموں کے عروج وزوال کا انحصار کن باتوں پر ہے۔ ابن خلدون سے لے کر پال کینیڈی تک لوگوں نے بارہا یہ داستان لکھی۔ مسلمان اس کے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ لیں۔ اس کے بعد انھیں یقین آ جائے گا کہ سازش کی نفسیات سے نکلنا اور مثبت انداز فکر اپنانا ہی ان کی ترقی کی طرف پہلا قدم ہے۔

_____ خورشید احمد ندیم

فہم انسانی کی فضلیت

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

جانوروں کا جہاں سے دل چاہتا ہے، کھا پی لیتے ہیں۔ کھیت کسی کا ہو، چر لیتے ہیں۔ پیشاب، پاخانہ کرنے میں انھیں موقع ومحل کا لحاظ نہیں ہوتا۔ وہ اپنی دوسری ضرورتیں بھی ایسے ہی پوری کر لیتے ہیں۔

دوسری طرف انسان ہر کام دیکھ بھال کر کرتا ہے۔ کھانے پینے، رفع حاجت اور زندگی کے دوسرے معمولات ایک قاعدے وضابطے کے مطابق انجام دیتا ہے۔ ایسا اس لیے ہے کہ اسے عقل اور سمجھ جیسی دولت عطا کی گئی ہے۔ پھر بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ انسان اپنی خواہش پوری کرنے میں جائز وناجائز کا فرق بھلا دیتا ہے۔ دوسروں کا مال ہتھیانے اور ان کی عزت پر حملہ کرنے میں اس کو شرم محسوس نہیں ہوتی۔ ماہرین حیاتیات کا کہنا ہے کہ جانوروں کی زندگی بھی ان خاص اصولوں اور رجحانات کے تابع ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان کی فطرت میں راسخ کر دیے ہیں۔ لیکن انسان کو یہ آزادی ملی ہوئی ہے کہ وہ اپنے مقام ومرتبے پر قائم رہے یا اس سے گر کر حیوانی سطح پر آ جائے۔ جب تک انسان ہوش وحواس میں ہوتا ہے، اسے خبر ہوتی ہے کہ وہ انسانی شرف کا پاس کر رہا ہے یا اپنے مقام سے گر چکا ہے۔ لہٰذا عقل اور سمجھ ہی ایسی چیز ہے جو انسانوں اور جانوروں میں تفریق کرتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

’’ہم نے جنوں اور انسانوں میں سے بہتوں کو دوزخ کے لیے پیدا کیا ہے۔ ان کے دل ہیں جن سے وہ سمجھتے نہیں، ان کے آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے نہیں، ان کے کان ہیں جن سے وہ سنتے ہیں۔ یہ چوپایوں کے مانند ہیں بلکہ ان سے بھی

زیادہ گم راہ ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو بالکل بے خبر ہیں۔'' (الاعراف ۷:۱۷۹)

ہم پر لازم ہے کہ قدرت کے اس قیمتی عطیے ''سوجھ بوجھ'' کو کام میں لائیں۔ اگر کوئی بات خود سمجھ میں نہیں آتی تو ان لوگوں سے پوچھ لیں جو ہمیں زیادہ سمجھ دار اور عقل مند دکھائی دیتے ہیں۔

______ محمد وسیم اختر مفتی

اے کاش

''میرا دل چاہتا ہے کہ میں اس کائنات میں بکھرے ہوئے تمام دکھی لوگوں کے دکھ اپنے دامن میں سمیٹ لوں۔ ان لوگوں کی پلکوں پر لرزتے ہوئے آنسو ایک ایک کر کے اپنے دل میں اتار لوں اور خود ایک سمندر بن جاؤں۔ میرا ظرف اتنا اعلیٰ ہو جائے کہ بڑی سے بڑی خطا درگزر کروں۔ اپنی خواہش کو مٹا دوں، میری ذات دوسروں کے لیے وقف ہو کر رہ جائے۔''

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

یہ ایک بچے کی تحریر ہے جو بچوں کے ایک ہفتہ وار اخبار میں چھپی۔ لکھنے والے کا انتہائی کرب اس اقتباس میں نمایاں ہے۔ اس کے علاوہ نوع انساں سے بے پایاں ہمدردی بھی اس میں جھلکتی ہے۔ بچوں کے احساسات خالص ہوتے ہیں۔ وہ مفادات کی دوڑ میں شامل نہیں ہوتے اور ردعمل کی نفسیات سے بھی محفوظ ہوتے ہیں۔ یہ دو محرکات بڑوں کی زندگی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں، مفادات انھیں بڑے سے بڑے اقدام پر اکساتے ہیں اور ردعمل ناگزیر کام سے بھی گریز پر مجبور کر دیتا ہے۔ انھی عوامل کے زیر اثر حق غیر مطلوب ہو جاتا ہے اور ناحق عین حق بن جاتا ہے۔ جب ہم بچے تھے، ایسی معصوم خواہشیں اور اس طرح کے درد مندانہ خیالات ہمارے دل میں بھی آتے تھے، لیکن بڑے ہوئے تو دوسری بچگانہ خواہشوں کے ساتھ یہ خیالات آنے بھی بند ہو گئے۔ ایسے لگتا ہے جیسے ہماری رقت جاتی رہی ہے اور ایک خشونت نے اس کی جگہ لے لی ہے۔ ہم نے عملیت پسندی کا نام دے کر اس خشونت کو چھپانا شروع کر دیا ہے۔ دوسروں کا درد محسوس کرنا، اس کو اپنا کرب بنا لینا اور اس احساس کو بانٹنے کی کوشش کرنا اعلیٰ انسانی جذبہ ہے۔ بچوں سے بڑھ کر اسے بڑوں میں ہونا چاہیے، لیکن کیا وجہ ہے کہ بڑوں میں یہ قریب قریب مفقود ہوا جاتا ہے؟

انسان غیر محدود خواہشیں لے کر پیدا ہوا ہے، لیکن اس کی صلاحیتیں محدود ہیں۔ وہ پر نہیں، لیکن تخیل پرواز رکھتا ہے۔ خاکی ہے، مگر اس کی نظر افلاک پر ہے۔ وہ زمین پر رہ کر سماوی خواہشیں پوری کرنا چاہتا ہے، حالاں کہ آسمان و زمین

میں بہت بعد ہے۔خواہشات اور حقائق کے اس تفاوت کی وجہ سے تمنائیں دم توڑتی ہیں اور آرزووں کا خون ہوتا ہے۔کچھ لوگ مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں، وہ آرزو کو کارِ عبث سمجھنے لگتے ہیں اور انھیں ہر طرف تاریکی نظر آنے لگتی ہے۔پھر یہ اسی یاس میں اپنی زندگی گزار دیتے ہیں، آدرش اور اعلیٰ انسانی مقاصد سے انھیں کوئی واسطہ نہیں رہتا۔یہ دوسروں کا بھلا کیا کریں گے، خود ڈانواں ڈول پھرتے ہیں۔اس کے برعکس کچھ افراد بے حس اور خود غرض بن جاتے ہیں۔وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ پوری مخلوق کا بھلا کرنا ممکن نہیں، ہاں اپنے حال میں مست ہوا جا سکتا ہے۔ایسے لوگ ہر طریقے سے خواہشیں پوری کر لینا اپنا وتیرہ بنا لیتے ہیں۔دوست دوست کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانے سے دریغ نہیں کرتا اور اپنا مطلب پورا کرنے کے لیے بھائی بھائی کا خون کر دیتا ہے۔بدقسمتی سے دنیا ایسے لوگوں سے بھری پڑی ہے، مگر ایسے اشخاص بھی مل جاتے ہیں جو انسانیت سے ناتا توڑنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ان کی ہر طرح کوشش ہوتی ہے کہ بلند اقدار پر قائم رہا جائے۔وہ بہت حد تک کامیاب بھی رہتے ہیں، لیکن اس دنیا کے کوتاہ وسائل کی طرح یہاں کا انسان بھی محدود قویٰ رکھتا ہے، اپنی حدود سے آگے جانا اور وسائل سے بڑھ کر کام کرنا، اس کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ہاں کچھ مثالیں ایسے لوگوں کی مل جاتی ہیں جو بظاہر اپنی طاقت اور میسر ذرائع سے ماورا ہو کر کام کرتے ہیں۔یہ جن دیو نہیں، بلکہ اپنی دھن کے پکے، لگن کے سچے انسان ہی ہوتے ہیں جو اپنے جنون (dedication) اور اپنی بے خودی و وارفتگی سے ایک مقام پا جاتے ہیں۔ایسے دیوانے ہر مذہب اور نظریے کے لوگوں میں ملتے ہیں۔دہریے طاغوت لادینیت کی خاطر اور مشرکین معبودان باطلہ کی رضا جوئی کے لیے تن من کی بازی لگا دیتے ہیں۔یہ ہونا چاہیے کہ خدا پرستوں کی صفیں بھی اس طرح کے افراد سے بھری ہوں، لیکن افسوس جب سے عشق کی آگ بجھی ہے، اندھیر ہو گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ انصار مدینہ کی صفت بیان فرماتے ہیں: ''اور وہ ان (مہاجرین یا دوسرے اہل ایمان) کو اپنے اوپر ترجیح دے رہے ہیں اگرچہ انھیں خود احتیاج ہو۔'' جب مکہ سے اہل ایمان ہجرت کر کے مدینہ آئے تو انصار نے اپنے باغات، اپنی تجارتوں اور اپنے مویشیوں میں مہاجرین کو حصہ دار بنا لیا۔پھر جب یہودی اپنی جائدادیں چھوڑ کر مدینہ سے گئے اور بحرین کا علاقہ اسلامی مملکت میں شامل ہوا تو انصار نے یہ سب کچھ بھی مہاجرین کو دے دیا، صرف دو تین غریب انصاریوں نے کچھ حصہ لیا۔انصار کی یہ بے مثال قربانی بعد کے مسلمانوں کے لیے ایک قابل تقلید نمونہ بنی۔حضرت ابو ہریرہ بیان فرماتے ہیں کہ ایک مہمان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تو آپ نے اسے اپنی ازواج کے پاس بھیجا۔وہاں سے جواب ملا کہ ہمارے پاس مہمانی کے لیے صرف پانی ہی ہے۔تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کون اس شخص کی مہمان نوازی کرے گا؟ ایک انصاری (سیدنا ابوطلحہ) نے ذمہ داری اٹھائی اور اپنے گھر لے جا کر بیوی سے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مہمان کی خاطر مدارات کرو۔اس نے کہا کہ ہمارے پاس تو صرف بچوں کا کھانا ہے۔انصاری نے کہا کہ کھانا تیار کرو اور بچوں کو سلا دو۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

جب وہ مہمان کے ساتھ کھانے بیٹھے تو بہانے سے چراغ گل کر دیا۔ خود بھوکے سوئے اور اپنے حصے کا کھانا مہمان کو کھلا دیا۔ حضرت عبداللہ بن عمر کی روایت ہے کہ ایک صحابی کے گھر تحفے میں بکری کی سری آئی تو انھوں نے یہ کہہ کر اپنے ہمسائے کے ہاں بھیج دی کہ میرا وہ بھائی اور اس کا کنبہ مجھ سے زیادہ ضرورت مند ہے۔ اس نے بھی یہی الفاظ کہے اور سری اگلے ہمسائے کے گھر روانہ کی، اس طرح سات گھروں سے ہوتی ہوئی وہ واپس پہلے گھر میں آ گئی۔

حقیقت میں مہمان نوازی ازل سے انسانی نفسیات میں رچی بسی ہے۔ دیہاتی معاشرت میں مہمان کی ضرورت کو مقدم رکھا جاتا ہے، چاہے اس کے لیے پیٹ پر پتھر کیوں نہ باندھنا پڑے۔ شہری تہذیبوں میں یہ روایت دم توڑ رہی ہے کیوں کہ معاش پیچیدہ ہونے کی وجہ سے شہروں میں آپا دھاپی کا ماحول ہوتا ہے اور ہر آدمی اپنی الجھنوں میں گرفتار ہوتا ہے۔ رشتوں کے کم زور پڑنے سے اس روایت میز بانی یا جذبہ قربانی پر کاری ضرب لگی، البتہ تکلف کچھ مہذب معاشروں میں رواج پا گیا۔ ''پہلے آپ، پہلے آپ'' اسی تہذیب کا ثمرہ ہے۔ ٹھوس بنیادیں نہ رکھنے کی وجہ سے یہ بھی مؤثر روایت نہ بن سکا۔ دوسروں کے دکھ درد کو محسوس کرنا اور اس کو بانٹنا کئی شعبے رکھتا ہے۔ اسی قبیل میں بچوں، بوڑھوں اور کم زوروں کا خیال رکھنا آتا ہے۔ مذہب و ملت سے قطع نظر انسانی ہم دردی رکھنا اسی کا اہم جز ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو روایت فرماتے ہیں ''رحم کرنے والوں پر خدائے رحمان رحم فرماتا ہے۔ اہل زمین پر رحم کرو، جو آسمان میں ہے وہ تم پر رحم کرے گا۔'' یہ دردمندی جانوروں کو بھی ایذا پہنچانے سے روکتی ہے۔ حضرت ابوہریرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ایک آدمی کو دوران سفر میں سخت پیاس لگی تو اس نے ایک کنویں میں اتر کر پانی پیا۔ جب وہ نکلا تو اس نے دیکھا کہ ایک کتا پیاس کی شدت سے گیلی مٹی چاٹ رہا ہے۔ اس نے سوچا کہ اس کتے کو اسی شدت سے پیاس لگی ہے جس شدت سے مجھے لگی تھی۔ وہ پھر کنویں میں اترا، اپنے جوتے کو پانی سے بھرا، اسے منہ میں دبا کر باہر نکلا اور کتے کو پانی پلا دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی نیکی کو قبول کرتے ہوئے اس کی بخشش کر دی۔ حاضرین صحابہ نے پوچھا، کیا جانوروں سے نیکی کا بھی ہمیں صلہ ملے گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ہر جگر تر (زندہ جان) میں اجر ملے گا۔''

دوسروں کے درد کو محسوس کرنا، ان کے دکھوں کا مداوا کرنا اور کسی ذی روح کی تکلیف کو اپنا کرب بنا لینا انتہائی بلند انسانی جذبہ ہے۔ کاش یہ الفاظ ایک بچے کی بجائے کسی بڑے کے قلم سے نکلے ہوتے: ''میرا دل چاہتا ہے کہ میں اس کائنات میں بکھرے ہوئے تمام دکھی لوگوں کے دکھ اپنے دامن میں سمیٹ لوں۔ ان لوگوں کی پلکوں پر لرزتے ہوئے آنسو ایک ایک کر کے اپنے دل میں اتار لوں اور خود ایک سمندر بن جاؤں۔ میرا ظرف اتنا اعلیٰ ہو جائے کہ بڑی سے بڑی خطا درگزر کروں۔ اپنی خواہش کو مٹا دوں، میری ذات دوسروں کے لیے وقف ہو کر رہ جائے۔''

______ محمد وسیم اختر مفتی

---

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

مقبول الرحیم مفتی

''حیات رسول امی''

مصنف: علامہ خالد مسعود،

ضخامت: ۵۹۷ صفحات بڑا سائز،

قیمت: ۳۷۵ روپے،

ناشر: دارالتذکیر، رحمان مارکیٹ، غزنی اسٹریٹ، اردو بازار، لاہور۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

امام حمید الدین فراہی رحمہ اللہ نے قرآن کو سمجھنے اور اس پر غور وفکر کرنے کے جو اصول مرتب کیے اور جس ہستی پر قرآن اترا، اس کے مقام ومرتبے اور حیثیت کو جس طرح خود قرآن کے ذریعے سے متعین اور واضح کیا، وہ اس دور کے علما کے لیے بلاشبہ ایک اجنبی شے ہے۔ امام فراہی نے اپنے زندگی بھر کے تدبر وتفکر کی یہ امانت اپنے منتخب شاگرد امین احسن کے سپرد کی۔ متھرا کے ڈسٹرکٹ ہسپتال میں جب استاد کے طلب کرنے پر امین احسن وہاں پہنچے تو استاد کی زبان سے صرف یہی الفاظ نکلے ''امین تم آ گئے''۔ ''ذکر فراہی'' کے مصنف نے اس امر پر حیرت کا اظہار کیا کہ سرائے میر سے متھرا جیسے دور افتادہ مقام پر طلب کرنے پر استاد نے شاگرد سے اس کے سوا کوئی بات نہ کی۔ البتہ اپنی فکری امانت کے 'امین' کو دیکھ کر اتنا خوش ہوئے کہ وفور جذبات سے بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئے۔ امین کو گلے لگا لیا۔ انھیں اطمینان ہو گیا کہ ان کی زندگی بھر کی مشقت رائگاں نہیں جائے گی۔

مولانا امین احسن اصلاحی نے ''تدبر قرآن'' لکھ کر نہ صرف اپنے جلیل القدر استاد کی امانت کو امت کے اہل علم تک پہنچانے کا حق ادا کر دیا، بلکہ تمام تر بے سروسامانی کے باوجود ''حلقۂ تدبر قرآن وحدیث'' میں سمٹ آنے والے جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کا ایک ایسا گروپ بھی تیار کر دیا جو قرآن پر غور وفکر کرنے اور اسے سمجھنے اور سمجھانے کے اس اسلوب سے آشنا ہو گیا جس کی بنا امام فراہی نے ڈالی تھی۔ جناب خالد مسعود اسی حلقۂ تدبر قرآن کے گھوارے میں پرورش پانے والے نوجوانوں کے

سرخیل تھے اور اپنے استاد کی روایت کی پیروی کرتے ہوئے بڑھاپے اور بیماری اور بے سروسامانی کے باوجود تفقہ فی الدین کی اس امانت کو آگے منتقل کرنے کا کٹھن فریضہ ادا کرتے رہے۔

حیات رسول امی جناب خالد مسعود کی آخری تصنیف ہے۔ ۱۹۶۷ء میں جب ان کے استاد امام امین احسن اصلاحی سے یہ فرمایش کی گئی تھی کہ وہ قرآن مجید کی روشنی میں سیرت النبی پر کتاب لکھیں تو مولانا نے 'تدبر قرآن' کے کام میں اپنی مشغولیت کا عذر پیش کرتے ہوئے اس رائے کا اظہار کیا تھا کہ خالد مسعود یہ کام کرنے کے اہل ہیں۔ حیاتِ رسول اُمی کی تمہید میں جناب خالد مسعود لکھتے ہیں: ''مولانا کے اس جواب پر میں دل ہی دل میں ہنسا کہ من آنم کہ من دانم، مولانا میرے بارے میں کس قدر خوش فہمی میں مبتلا ہیں، اس طرح بات آئی گئی ہوگئی اور میں نے اس موضوع پر سوچا تک نہیں۔'' لیکن یہ سعادت بھی آخر کار ان کے حصے میں آئی کہ قرآن کی روشنی میں قرآن کو انسانیت تک پہنچانے والے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے کارنامۂ حیات کو مرتب صورت میں پیش کریں۔

قرآن بلا شبہ قیامت تک کے لیے آسمانی ہدایت کی آخری کتاب ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس میں رسول اللہ کی دعوت، انذار و تبشیر اور اظہار دین وغلبۂ دین کی جدوجہد اور اس کی کامیابی کی پوری روداد بھی شامل ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے جد امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد کی دو شاخوں بنو اسمٰعیل (مشرکین عرب) اور بنو اسحٰق (یہود) اور ان کے ساتھ نصاریٰ کو جس انداز اور جن الفاظ میں ہدایت کی طرف بلایا، ہدایت کو قبول کرنے والوں کو امت مسلمہ کی شکل دی، ہدایت کا انکار کرنے والوں کو برے انجام سے ڈرایا اور مدینہ میں دار الہجرت میسر آنے کے بعد دین حق کو دوسرے ادیان پر غالب کرنے کے لیے اتمام حجت کے بعد دعوت کا انکار کرنے والوں کو اس دنیا میں ان کے انجام تک پہنچایا، اس کی پوری تفصیل بھی قرآن کا حصہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول اکرم کو فریضۂ نبوت و رسالت سے تعلق رکھنے والے ان سارے کاموں کی تکمیل کے لیے ہدایت و رہنمائی قرآن کے ذریعے سے فراہم کی گئی اور آپ اللہ کے دین کو جزیرہ نمائے عرب میں دوسرے تمام دینوں پر غالب کر کے اس دنیا سے تشریف لے گئے۔ اس پہلو سے اگر دیکھا جائے تو قرآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے حالات و واقعات کا ایسا بیان ہے جس میں آپ کی حیثیت رسالت کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ لیکن بد قسمتی یہ ہے کہ ہمارے سیرت نگاروں نے رسول اللہ کی زندگی کے حالات کو قرآن کی روشنی میں سمجھنے اور بیان کرنے پر بہت کم توجہ دی ہے۔

''حیات رسول امی'' لکھ کر جناب خالد مسعود نے اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ تمہید میں لکھتے ہیں:

''قرآن پڑھیے تو اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات وصفات، آپ کی بعثت کے کوائف، دعوت دین کے مراحل ہجرت، جنگوں کے واقعات، مشرکین اور یہود کے ساتھ اہم بحثوں اور حضور کی زندگی سے متعلق دیگر موضوعات کا بیان ملتا ہے۔ ایک آدمی قرآن کا مطالعہ غور سے کرے تو وہ سیرت النبی کے تمام ضروری مباحث سے آگاہی حاصل کر لیتا ہے۔ اس

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

لیے یہ بات علمی حلقوں میں مانی جاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات پاک یا سیرت کا سب سے اہم ماخذ قرآن مجید ہے۔اس کے بعد احادیث صحیحہ اور اولین کتب سیرت کا مطالعہ اس کے مآخذ کی حیثیت سے رہنمائی دیتا ہے۔اس اعتراف کے باوجود عملاً یہ دیکھا گیا ہے کہ حضور کے جدید سیرت نگاروں نے ماضی میں لکھی گئی کتب سیرت ہی پر اعتماد کیا ہے۔جن لوگوں نے قرآن سے استفادہ کیا ہے، وہ بالعموم محض آیات نقل کر دیتے ہیں، ان سے سیرت نگاری میں مدد نہیں لیتے۔اس لیے نقل کردہ آیات بے ربط سی نظر آتی ہیں''۔(۱۱)

''میری کوشش رہی ہے کہ کتب سیرت کی روایات سے بھی بھرپور استفادہ کروں۔بالعموم میں نے ان کو سیرت نگاروں کی تحقیق و بیان کی روشنی میں قبول کر لیا ہے، لیکن جہاں کوئی روایت رسولوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی سنت کے موافق نظر نہیں آئی، میں نے اس کا سقم واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ان تمام اعتبارات سے قارئین اس کتاب کو دوسری کتب سیرت سے مختلف پائیں گے۔لیکن انشاء اللہ اس کی ہر اہم بحث دلائل و شواہد سے تہی دامن نہیں ہوگی۔''(۱۲)

مصنف کا یہ دعویٰ کسی تعلّی پر مبنی نہیں۔انھوں نے جہاں بھی روایات میں ابہام یا اختلاف کی جھلک دیکھی ہے، اسے قرآنی استدلال سے رفع کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔اس کے ساتھ ساتھ مناسب مقامات پر مستشرقین کی پیدا کی ہوئی غلط فہمیوں کی تردید اور قرآن کی روشنی میں اصل حقیقت کی وضاحت بھی کی ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

معروف غلط فہمیوں کی تردید کرتے ہوئے انتہا پسندانہ رویہ اختیار نہیں کیا گیا۔مثال کے طور پر اگر اس بات کی تردید کی گئی ہے کہ بچپن میں جناب عبدالمطلب کی وفات کے بعد ایام یتیمی میں نبی اکرم کی سرپرستی اور پرورش جناب ابوطالب نے نہیں، بلکہ جناب زبیر بن عبدالمطلب نے کی تھی جو اپنے والد کی وفات کے بعد تقریباً چودہ برس بنو ہاشم کی سربراہی پر فائز رہے تو دوسرے مقام پر اس امر کی وضاحت بھی موجود ہے کہ جناب ابوطالب نے بنو ہاشم کا سردار بننے کے بعد دم واپسیں تک نبوت کی راہ میں نہ صرف یہ کہ کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کی، بلکہ سرداران قریش کے تمام تر دباؤ کے باوجود اس مقصد کے لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پوری طرح وہ خاندانی تحفظ مہیا کیا جس کے باعث قبائلی معاشرے میں حضور کے لیے دین کی دعوت پیش کرنا ممکن ہوا۔

مصنف نے تمہید میں اس کتاب کے بارے میں اپنے قلمی سفر کی روداد بیان کرتے ہوئے وضاحت کی ہے کہ ۱۹۸۶ء میں انھوں نے ''ہولی فرقان فاونڈیشن'' کے زیر اہتمام کانفرنس میں ''قرآن کا تصورِ جنگ'' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا جسے اہل علم نے پسند کیا۔اس مقالے کی تیاری کے دوران میں انھیں محسوس ہوا کہ سیرت کی کتابوں میں قرآن کے مقابلے میں روایات پر زیادہ انحصار کیا گیا ہے، اور بعض ایسی روایات لوگوں میں مشہور ہو چکی ہیں جو قرآن کے بیان کردہ اصولوں سے مطابقت نہیں رکھتی۔اس حقیقت کے انکشاف پر انھوں نے قرآن کی روشنی میں غزوۂ بدر، صلح حدیبیہ اور فتح مکہ پر تحقیقی مضامین شائع کیے۔پھر اہل علم کے اصرار پر عہد نبوی کی جنگوں کے پورے سلسلے پر اپنی تحقیق قلم بند کی، مگر دوستوں کے تقاضے پر جب اس تحقیق کو کتابی شکل دینے کے لیے نگاہ ڈالی تو اس نتیجے پر پہنچے کہ اس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارکہ اور آپ

کے منصبِ رسالت کا ایک یک رخا اور ناقص تصور سامنے آتا ہے۔ دورِ رسالت کی جنگوں کے تذکرے کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل شخصیت اور آپ کی دعوت کا بھرپور تعارف شامل کرنے کے لیے نئے عنوانات قائم کر کے ان پر تحقیق کی اور یوں سیرتِ طیبہ پر قرآن کی روشنی میں یہ نئی کتاب وجود میں آئی۔

مصنف اس اعتبار سے تو اپنی کوشش میں کامیاب نظر آتے ہیں کہ انھوں نے پورے دورِ رسالت کے اہم واقعات اور بالخصوص غزوات اور عسکری اقدامات کے جواز اور حکمتوں کو قرآن کے ساتھ مربوط کر دیا ہے، لیکن صدیوں سے امت میں معروف تصورِ دین اور اس تصنیف کے بارے میں خود مصنف کے بیان کردہ پس منظر کے باعث دعوت کے اسلوب اور شرائط کے وہ بہت سے پہلو تشنہ رہ گئے ہیں یا سرے سے بیان نہیں ہوئے جن کی ہدایت قرآن نے دی اور پیغمبر نے ہمیشہ ان کی پابندی کی۔ آج امت مسلمہ سیاسی آزادی کے باوجود علمی، فکری، معاشی اور تمدنی مغلوبیت کے جس دور سے گزر رہی ہے، اس میں زیادہ ضرورت اس امر کی ہے کہ قرآن کی روشنی میں اس اسلوبِ دعوت کو اجاگر کیا جائے، جسے نبی اکرم نے مکہ اور مدینہ دونوں جگہ ہر حال میں برقرار رکھا۔ اگر قرآن کو بنیاد بنا کر اہل علم احادیث کے مجموعوں اور سیرت کے ابتدائی ماخذ کی ورق گردانی کریں تو امن اور جنگ، صلح اور دشمنی کی تمام کیفیتوں میں اعتدال پر مبنی پیغمبرانہ طرزِ عمل کی تصویر کشی ممکن ہے۔ جس کے بغیر دعوت کا کام کیا ہی نہیں جا سکتا۔

موجودہ زمانے میں آزادی اظہار کے مواقع اور ذرائع ابلاغ کی ترقی نے ''اظہارِ دین'' کے جو بے پناہ امکانات پیدا کر دیے ہیں، وہ صرف دعوت کے ذریعے سے ہی بروئے کار آ سکتے ہیں۔ اب یہ امت کے اہلِ علم کی ذمہ داری ہے کہ وہ نہ صرف قرآن و سنت سے شرعی وجوب اور اس کے طریق کار کی شرح و وضاحت کریں، بلکہ اس کے لیے اہل افراد کی تیاری کا کام بھی کریں۔ جناب خالد مسعود نے ''حیات رسول امی'' لکھ کر علمی سطح پر اس راستے کی نشان دہی کر دی ہے، جس پر چلتے ہوئے قرآن کے صفحات پر پھیلے نقوش دعوت کو چراغ راہ بنایا جا سکتا ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

کتاب کا اسلوب اور زبان سادہ اور عام فہم ہے، مصنف نے شعوری طور پر ایسے مشکل الفاظ اور دینی اصطلاحات کے استعمال سے گریز کیا ہے جنھیں آسانی سے سمجھنا اب عام طور پر قارئین کے لیے ممکن نہیں رہا۔ کتاب کا سائز اگرچہ قدرے بڑا ہے، لیکن ضخامت سمیٹنے کے لیے اختیار کیا گیا ہے۔ ''دار التذکیر'' نے کاغذ، جلد بندی، کمپوزنگ اور طباعت کے جس معیار کے ساتھ یہ کتاب شائع کی ہے، قارئین یقیناً اسے پسند کریں گے۔

خیال و خامہ

جاوید

○

امن کا نام لبوں پر ہے، سناں پہلو میں
اک زباں منہ میں ہے اور ایک زباں پہلو میں

اب تو لگتا ہے کہ تہذیب کا حاصل ہے یہی
ہاتھ میں جام، کوئی حورِ جناں پہلو میں

قافلہ ہے نہ جرس، گرم سفر ہوں پھر بھی
ساتھ چلتی ہے تو اک ریگِ رواں پہلو میں

سیر دیکھیں گے، ذرا دیر کو آئے تھے مگر
دل نہیں، یہ تو نکل آیا جہاں پہلو میں

یوں تو قرآن بھی ہے خانقہوں کی زینت
ساتھ رہتا ہے مگر سر نہاں پہلو میں

اسی امید پہ کھویا تھا کہ پا لیں گے اِسے
دل نے چھوڑا نہ کوئی اپنا نشاں پہلو میں

لوٹ آتی ہے نوا ہو کہ فغاں ہو میری
یہ ترا دل ہے کہ اک سنگِ گراں پہلو میں

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com